روشنی کے دریچے

سید احتشام حسین

مرتبہ
جعفر عسکری

احتشام اکیڈمی، ۱۔ نور اللہ روڈ، الہ آباد (یو۔پی)

روشنی
کے
دریچے

اس کتاب کی اشاعت میں
اترپردیش اردو اکیڈمی
کا مالی تعاون حاصل ہے۔ اس اشتراک کیلئے
ہم اکیڈمی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ترتیب

★ وجدان

غزلیں

★ شوقِ فضول

نظمیں

★ آوازیں

نظمیں

(ا۔ ح۔ نوراز کے فرضی نام سے شائع ہوئیں)

بار اول سنہ ۱۹۸۳ء

تعداد چھ سو ۶۰۰

طابع نیشنل آرٹ پرنٹرس۔ الہ آباد

خوش نویس ابن حسن

قیمت دس روپئے

ملنے کا پتہ

احتشام اکیڈمی

۱۔ نور اللہ روڈ۔ الہ آباد (یو۔پی)

شاعری کبھی فن بنتی ہے۔ کبھی مختصر صنعت گری کی منزل میں رہ جاتی ہے، پہلے انداز کی شاعری شاعر کے وارداتِ قلب و نظر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دوسری محض موزونئ طبع کا۔

شاعری شخصیت سے گریز اور فرار ہے یا اس کا اظہار، نفسیاتی نقطۂ نظر سے دونوں صورتیں اظہارِ ذات ہی کے دائرے میں آتی ہیں۔ یہ البتہ کہہ سکتے ہیں کہ اس حقیقت کا ایک حصہ شعوری ہوگا اور ایک نیم شعوری۔ اگر کسی شکل میں بھی شاعری کا تعلق شاعر کے ذہنی اور جذباتی تجربوں سے ہے۔ تو اس صورتِ حال سے مفر ممکن نہیں۔ شاعری شاعر کے وجود سے الگ ہو کر بھی اس سے متعلق رہتی ہے۔ وہ بے تعلق "کُل" نہیں جسے کسی غیر شخصی فنی اصول سے سمجھا جا سکے۔ نظم کی خوبیوں اور خامیوں کا تعلق شاعر ہی کے احساسِ فن، جذبے اور ادراکِ حقیقت سے ہے اس لئے شاعر کو نظر انداز کر کے شعر کا مطالعہ ممکن نہیں کہا جا سکتا۔

سید احتشام حسین
(ڈائری سے ماخوذ)

حرف آغاز

والد محترم پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مرحوم کے شعری مجموعہ "روشنی کے دریچے" کی ترتیب میرے لئے کتنا سخت امتحان تھا۔ اس کا اندازہ قارئین خود کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے شعری مجموعہ کو کس طرح مرتب کرتے اور اسکی ترتیب میں اُن کا ناقدانہ شعور کس قدر حُسن و سلیقہ پیدا کرتا اس کو سوچ کر ہی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ البتہ یہ دیکھکر مجھ میں ایک قسم کا اعتماد پیدا ہوا کہ والد مرحوم نے اپنی سبھی غزلوں اور نظموں کی تخلیق کی تاریخ درج کر دی ہے جس سے تاریخ وار ترتیب میں بہت آسانی ہوئی۔

اس مجموعہ میں جو غزلیں اور نظمیں شامل ہیں وہ ۱۹۳۳ء کے بعد لکھی گئی ہیں۔ حالانکہ شعر و ادب سے والد مرحوم کی دلچسپی کا آغاز ۱۹۲۸ء ہی سے ہو چکا تھا۔ اور خود انہیں کے الفاظ "میں اسی وقت سے الٹے سیدھے اشعار موزوں ہونے لگے تھے۔"[1] غالباً ان کے تنقیدی شعور نے اس ابتدائی دور کے کلام کو اس معیار کا نہیں سمجھا کہ اسے محفوظ رکھا جا سکے۔ اس لئے ہر ممکن کوشش کے باوجود ۲۸ء سے ۳۳ء تک کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

مطالعہ کی آسانی کیلئے زیر نظر مجموعہ کو میں نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ جسے "وجدان" کا نام دیا گیا ہے اس میں ۱۹۳۳ء سے ۱۹۷۱ء تک کی غزلیں شامل ہیں۔ نظموں کیلئے خود والد مرحوم نے "شوقِ فضول" عنوان قائم کر دیا تھا۔ اس حصہ میں ان کی ساری نظمیں شامل کر لی گئی ہیں۔

۱۹۶۵ء کے بعد سے بعض شعری رجحانات سے متاثر ہو کر انھوں نے ا۔ح۔ نوازلہ کے فرضی نام سے بڑی تعداد میں نظمیں کہیں جن میں بہت سی بعض رسائل میں شائع بھی ہوئیں۔ اس حصہ کو خود مرحوم نے "آوازیں" کا نام دیا تھا۔ "آوازیں" پر جلد ہی ایک مضمون لکھنے کی کوشش کروں گا۔

والد مرحوم نے کبھی بحیثیت شاعر شہرت حاصل کرنے کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ مخصوص نشستوں میں دوستوں کے اصرار پر ہی شعر پڑھتے تھے اور داخلی کیفیات و محسوسات سے متاثر ہو کر ہی شعری تخلیق کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ ان کا ناقدانہ شعور، شعری شعور سے کس طرح ہم آہنگ ہے۔ اس کا فیصلہ قارئین ہی پر منحصر ہے۔

جعفر عسکری
مرتب

---

(۱) عکس اور آئینے ص ۱۷۸

بے لطفِ شباب زندگانی کیسی
گرمائے نہ جو دِل وہ کہانی کیسی
تیزی ہو طبیعت میں تو ہو دل میں اُمنگ
جو آگ نہ برسائے جوانی کیسی

حرمان و الم سے شادمانی اچھّی
پانی سے شرابِ ارغوانی اچھّی
کچھ کام تو ہو جاتا ہے الٹا سیدھا
پیری سے بہر حال جوانی اچھّی

بچپن کی نہ پیری کی کہانی ہے پسند
جو سب سے حسین ہے وہ نشانی ہے پسند
جنت میں بلاتا ہے عطا کر کے شباب
شاید کہ خدا کو بھی جوانی ہے پسند

اک روز بڑھاپے میں کماں ہونا ہے
اور چادرِ خاک میں نہاں ہونا ہے
کس طرح رکھیں دل سے جوانی کو عزیز
جب مر کے پھر اک بار جواں ہونا ہے

سوئی ہوئی اُمید جگانے والے
بگڑی ہوئی تقدیر بنانے والے
اس طرح تو زنہار نہ ہوگی تسکین
یوں بھی کبھی آ خواب میں آنے والے

منجمد کردوں آفتاب کو میں
ٹوٹنے بھی نہ دوں حباب کو میں
جلد آنے کا گر کرو وعدہ
روکوں جاتے ہوئے شباب کو میں

○

ہر فکر عروسِ شادمانی بن جائے
ہاں موت کا خوف بھی کہانی بن جائے
آئے گا سمجھ میں رازِ ہستی اس دم
مقصودِ حیات جب جوانی بن جائے

○

اُس شوخ نگہ کی بے عنانی سے پوچھ
ہاں پوچھ ادائے دلستانی سے پوچھ
کیوں حُسن کی ہر نظر پہ مٹ جاتی ہے
یہ بات نہ سر پھری جوانی سے پوچھ

○

اک شوخ پری رو کا اشارہ جیسے
دلکش کسی گلرو کا نظارا جیسے
پہلے تھا سبک بعد میں یوں آیا شباب
طوفانِ بلاخیز کا دھارا جیسے

کسی مایوس تمنا کا سہارا جیسے
شکلِ مانوس کا دھندلا سا نظارا جیسے
فکر میں غرق اکیلے وہ ترا مشقِ خرام
چرخ پر شام کا رنگین ستارا جیسے

کسی گم گشتہ کو رستے پہ لگا دے کوئی
روشنی جیسے اندھیرے میں دکھا دے کوئی
کل وہ اک عمر پہ گویا ہوئے مجھ سے اسطرح
مضمحل ساز کو جس طرح بجا دے کوئی

اے دیدۂ خونبار کی حسرت آجا
دامن میں لئے عشق کی دولت آجا
بے نور سی ہے شمعِ تمنّا کی لَو
مدہم ہے بہت سازِ محبت آجا

وِجدان

سنہ ۳۳ء تا سنہ ۷۲ء

غزلیں

آپ نے مسکرا کے دیکھ لیا ۔۔۔ حدِ صبر آزما کے دیکھ لیا
گردشِ غم سے نہ بچ سکا آخر ۔۔۔ ہم نے دامن بچا کے دیکھ لیا
تم نے بیمار کا جو ذکر کیا ۔۔۔ دشمنوں نے بھی آ کے دیکھ لیا
میرے مرنے کا اعتبار نہ تھا ۔۔۔ خود سے نشا نہ ہلا کے دیکھ لیا
بھول جانا انہیں محال سا ہے ۔۔۔ ہر طرح سے بھلا کے دیکھ لیا
گھر کی تاریکیاں نہیں مٹتیں ۔۔۔ آگ دل میں لگا کے دیکھ لیا
نہیں جاتی ہے دل کی ویرانی ۔۔۔ حسرتوں نے بسا کے دیکھ لیا
کوئی سمجھا نہ دل کا افسانہ ۔۔۔ اک جہاں کو سنا کے دیکھ لیا
روٹھ کر پھر نہ آئے راہ پہ وہ ۔۔۔ سو طرح سے منا کے دیکھ لیا

میں نے باتوں میں زہر گھولا ہے ۔۔۔ میری باتوں کا اعتبار نہ کر
زہر بن جائے گی یہ غم خواری ۔۔۔ میری افسردگی سے پیار نہ کر

اُن کی جبیں پہ بھی عرقِ انفعال ہے
شاید یہی جنونِ وفا کا مآل ہے

سائے میں بجلیوں کے ٹھہرنا محال ہے
اُن سے نظر ملائے یہ کس کی مجال ہے

سیرِ چمن کا ذکر کہاں انکے بعد سے
میرا تو اب اُدھر سے گذرنا محال ہے

تاریکیوں میں رات کی جیسے وہ آ گئے
کتنا سکوں نواز فریبِ خیال ہے

چاہے تو رشتۂ غم و امید توڑ دے
معصومِ عشق آپ اسیرِ جمال ہے

ترکِ وفا کو سوچ کے گھبرا رہا ہے دل
اپنا خیال ہے کہ تمہارا خیال ہے

ویسے ملا تو تیرے تغافل میں بھی مزا
کیفِ نگاہِ لطف مگر لازوال ہے

کیوں پیش کر نہ دوں دلِ بے مدعا کہ یہ
ان کی نگاہِ شوق کا پہلا سوال ہے

○

پھر کہیں سے پیامِ درد آیا
خون سے تر پھر آستیں ہے آج
کوئی خوابوں میں یاد کرتا ہے
یہ جہاں کس قدر حسیں ہے آج

○

مت سمجھ آسودۂ ساحل ہمیں اے ہمنشیں

آپڑا جب وقت طوفانوں سے ہم ٹکرا گئے

بستیاں ہوتی گئیں برباد ویرانے بڑھے

ہم یونہی منزل بہ منزل جانبِ صحرا گئے

اک ادھورا خواب بن کر رہ گئی ہے زندگی

اے خیالِ دوست اب تجھ سے بھی ہم گھبرا گئے

نور کے ہمراہ دل میں ظلمتیں بھی آگئیں

لاکھ رہ دکا غم کے بادل ذہن و دل پر چھا گئے

یوں نہ انکو دیکھ اے گلچیں بڑے نازک ہیں یہ

پھول کتنے تیری چشمِ گرم سے کمھلا گئے

○

برہمی ہے نظامِ فطرت میں　　یوں کبھی لیتا ہے کوئی انگڑائی

اب گریباں میں تار بھی نہ رہے　　خود انھوں نے کہا ہے سودائی

○

یہ جمال اور یہ شباب ترا
دل سے ممکن نہیں جواب ترا

دیکھ کر رو دیئے بے نقاب ترا
عشق سوچا کیا جواب ترا

آ حقیقت بھی سامنے آجائے
یوں تو دیکھا بہت ہے خواب ترا

بھر گئی کائنات نغموں سے
کیا کہیں چھڑ گیا رباب ترا

مجھ پہ در پردہ مہر کی وہ نظر
اور دکھانے کو وہ عتاب ترا

پھوٹ پڑی ہے بہار دنیا پر
کیا اٹھا گوشۂ نقاب ترا

یہی کونین کو سنبھالے ہیں
میری دیوانگی شباب ترا

دل میں شمعیں ہزار جل اٹھیں
کیا تبسم تھا کامیاب ترا

زہر کا گھونٹ بن گئی تھی شراب
ہائے اس دن وہ اجتناب ترا

ڈوبتی روح کو سنبھال گیا
وقتِ رخصت وہ اضطراب ترا

تو تو خاموش ہی رہا لیکن
سن لیا شوق نے جواب ترا

○

کاٹی ہے انتظار میں مشکل سے شامِ غم
اب آئیے حضور کہ تاخیر ہو چکی

جاں دینے پر بھی آپ نہ آئے ہزار حیف
جو اختیار میں تھی وہ تدبیر ہو چکی

پوچھا کسی نے غیر سے حالِ مریضِ غم
ہوتی تھی جتنی آہ میں تاثیر ہو چکی

جس میں سوا تمہارے کسی کا گذر نہیں
ایسے بھی اک جہان کی تعمیر ہو چکی

تکمیل ہو رہی ہے مرے جذبِ عشق کی
ہر شے میں منعکس تری تصویر ہو چکی

ہر آرزو فریب تھی جد و جہد کے بعد
خوابِ حیات کی مرے تعبیر ہو چکی

○

دیکھی ہے تری چشمِ محبت میں گرانی
اب زیست مجھے بار ہے معلوم نہیں کیوں

کیا اور بڑا مرحلہ درپیش ہے کوئی
دلِ عشق سے بیزار ہے معلوم نہیں کیوں

○

○

مصرفِ عہدِ جنوں موت سے پیماں ہونا
حاصلِ عمرِ وفا تیرا پشیماں ہونا

تیری دشوار نگاہی کی قسم ہے ساقی
میری مشکل کو نہ آیا کبھی آساں ہونا

جو نہ سمجھے کہ نئی راہ نکالیں کیوں کر
دیکھ جاتے مرے دامن کا گریباں ہونا

اس کی راہیں سببِ حیرتِ اربابِ جنوں
منزلِ عشق میں گلشن نہ بیاباں ہونا

کتنی پُر پیچ و خطرناک ہے راہِ اُلفت
اس کے ہر ذرّے کا ممکن ہے بیاباں ہونا

وہ تیرا سرد تبسم مرے شکووں کے بعد
خود مرا اپنے کئے پر وہ پشیماں ہونا

اس کو کہتے ہیں محبت میں فنا ہو جانا
خاک کو بھی مری آیا نہ پریشاں ہونا

وہ تری نیم نگاہی وہ لبوں کی جنبش
میری ہستی کے وہ ہر تار کا لرزاں ہونا

میں اس اندازِ محبت کو سمجھ ہی نہ سکا
کبھی ملنا تو کبھی مجھ سے گریزاں ہونا

کوئی بتلائے محبت میں یہ کیا ہوتا ہے
اُن سے ملنے پہ مرا اور پریشاں ہونا

میں نے کیا سیکھ لئے ضبطِ جنوں کے انداز
اب وہ ہیں اور مری ہر بات پہ حیراں ہونا

بس یہی سوچ کے دے لیتا ہوں دل کو تسکین
گھر کی قسمت ہی میں لکھا تھا بیاباں ہونا

تو جب آیا تھا تو صحرا میں بھی آئی تھی بہار
تیرا جانا تھا کہ گلشن کا بیاباں ہونا

○

میں دارِ ہجر پہ ہر روز قتل ہوتا ہوں   نہ مجھ سے پوچھ محبت کی زندگی کیا ہے

○

○

سوئے دار و رسن اس شوق سے دیوانہ آتا ہے
تڑپ کر جیسے روشن شمع پر پروانہ آتا ہے

نہاں رکھنے کی کوشش پر بھی بے تابانہ آتا ہے
زبانِ حُسن پر جب عشق کا افسانہ آتا ہے

سرِ بزمِ طرب اس طرح اُٹھتی ہیں تری نظریں
چھلک کر جیسے دستِ رند میں پیمانہ آتا ہے

وہ دیوانہ جسے تو دے چکا پیغامِ آزادی
سوئے زندانِ اُلفت جھوم کر رندانہ آتا ہے

اسی دن کے لئے تو میں نے زنجیرِ خرد توڑی
فریبِ رنج و غم میں اب کہیں دیوانہ آتا ہے

زمانے کو نئے انداز سے بیدار کرتا ہوں
بدل جاتی ہے دنیا جب مرا افسانہ آتا ہے

جسے سنا ہو سن جائے کہانی حسن و اُلفت کی
مجھے لے دیکے دنیا میں بس اک افسانہ آتا ہے

دیکھ کر جادۂ ہستی پہ سبک گام مجھے
دُور سے تکتی رہی گردشِ ایام مجھے

ڈال کر ایک نظر پیار کی میری جانب
دوست نے کر ہی لیا بندۂ بے دام مجھے

کل سنیں گے وہی مژدہ مری آزادی کا
آج جو دیکھ کے ہنستے ہیں تہہِ دام مجھے

دیکھ لیتا ہوں اندھیرے میں اُجالے کی کرن
ظلمتِ شب نے دیا صبح کا پیغام مجھے

نہ تو جینے ہی میں لذت ہے نہ مرنے کی اُمنگ
ان نگاہوں نے دیا کون سا پیغام مجھے

میں سمجھتا ہوں مجھے دولتِ کونین ملی
کون کہتا ہے کہ وہ کر گئے بدنام مجھے

گرچہ آغازِ محبت نے دیئے ہیں دھوکے
لئے جاتی ہے کہیں کاوشِ انجام مجھے

تیرا ہی ہو کے جو رہ جاؤں تو پھر کیا ہوگا
اے جنون اور ہیں دنیا میں بہت کام مجھے

یہ کس کی گرم گرم سانس اور گرم ہو گئی
یہ کس کی نرم گفتگو کچھ اور نرم ہو گئی

نقش جو باعثِ آزار نظر آتا ہے
وجہِ تسکینِ دلِ زار نظر آتا ہے

جانتا ہے کہ نہ راس آئے گی بیماریٔ غم
پھر بھی دل خوگرِ آزار نظر آتا ہے

کیا بچائے گا مجھے زعمِ جنونِ خودسر
ہر طرف سلسلۂ دار نظر آتا ہے

جورِ گلچیں سے ہے محفوظ چمن کیسے کہوں
دل میں ہر گل کے مجھے خار نظر آتا ہے

جذب آنکھوں میں ہوا ہے کوئی جلوہ اسطرح
"جس کو دیکھو وہ طرحدار نظر آتا ہے"

سخت حیراں ہوں کہ کیونکر وہی رنگِ رخِ دوست
کبھی سادہ کبھی پُرکار نظر آتا ہے

تھک کے رہ جاتا ہے جب عقل کا ذوقِ تگ و تاز
عشق ہی قافلہ سالار نظر آتا ہے

روک لی ہیں جو مرے دامِ طلب نے راہیں
جلوۂ دوست گرفتار نظر آتا ہے

دل سمجھتا ہے یہ جنت ہے تھکے ہاروں کی
جب ترا سایۂ دیوار نظر آتا ہے

ق

کیسے طے ہوگی تمنائی رہِ دور دراز
نہ کوئی نخل نہ گلزار نظر آتا ہے

نہ محبت کی کڑی دھوپ کا گھٹتا ہے جلال
نہ ترا سایۂ دیوار نظر آتا ہے

کس کی عیسیٰ نفسی مائلِ پرسش ہے کہ آج
دلِ دیوانہ بھی ہشیار نظر آتا ہے

لبِ خاموش پہ ہے یورشِ اظہارِ خیال
کچھ جو وہ مائلِ گفتار نظر آتا ہے

کیا دیا تیری نگاہوں نے کوئی سخت جواب
سرنگوں جذبۂ خوددار نظر آتا ہے

کس میں جرأت ہے کہ اب لوٹے چمن کی رونق
غنچہ غنچہ مجھے بیدار نظر آتا ہے

○

کچھ ایسی ہی گذری ہے کہ خوں ہو گیا دل بھی
آنکھوں کو لہو رونے کا ارماں تو نہیں ہے

روشن نہ سہی صبحِ وطن اے دلِ پُر شوق
بے رونقیِ شامِ غریباں تو نہیں ہے

ہے یورشِ آلام بھی احساسِ سکوں بھی
کشتی کو سنبھالے ہوئے طوفاں تو نہیں ہے

اے ضبط جو کر دیتا ہے زخمی دل و جاں کو
چہرے سے مرے غم وہ نمایاں تو نہیں ہے

کیا جانئے کب راہ پہ لے آئے انہیں بھی
میرے ہی لئے گردشِ دوراں تو نہیں ہے

اک یادِ بہاریں لئے آ جاتی ہے اکثر
دل کا چمن اتنا ابھی ویراں تو نہیں ہے

کس طرح بڑھے قیمتِ خونِ دلِ پُر شوق
آنسو ہیں ترا گوشۂ داماں تو نہیں ہے

سر کر لیں اسے بھی تو کہیں سایہ میں دم لیں
اے شوق کوئی اور بیاباں تو نہیں ہے

...پہلے تو جستجو میں انھیں کی نظر گئی ناکام ہو کے پلٹی تو پھر دربدر گئی

...ب یادِ موجِ بادہ کی صورت گذر گئی شبہائے تارِ ہجر کو سرشار کر گئی

...ب تک رہِ حیات اندھیری ہے ہم نشیں کیسے یقین ہو کہ شبِ غم گزر گئی

...ہ آخرِ شب اور سحر کا وہ انتظار یہ کس جگہ پہ گردشِ دوراں ٹھہر گئی

...ں بھی ہوا ہے کارگہِ کائنات میں بگڑی جو زلفِ دہر تو بہتر سنور گئی

...زل سے دُور ہے ابھی ہر کاروانِ شوق بے نقشِ پا تھی راہ جہاں تک نظر گئی

...را ہوا ہوں گو ستمِ روزگار کا یہ دل شکستگی بھی محبت کے سر گئی

...یا دل پذیر صبح تھی کیا دل نواز شام جاتے ہی اُن کے رونقِ شام و سحر گئی

...س کی نگاہ نے تو سہارا دیا بہت میری ہی بے دلی مجھے مایوس کر گئی

...عقل و خرد کی بھی نہ چلی جس مقام پر سو بار اس کے آگے جنوں کی نظر گئی

...یں وہ زنجیر کبھی توڑ سکوں گا کہ نہیں شیشۂ نو سے جبیں چھوڑ سکوں گا کہ نہیں

نگاہِ دوست بہ اندازِ التفات ملی
اب اور چاہیئے کیا دولتِ حیات ملی

ہزار بار کفن سر سے باندھ کر نکلے
ہزار بار تری راہ میں حیات ملی

ترا خیال تھا جب تک یہ کائنات نہ تھی
ترے خیال سے کچھ ہٹ کے کائنات ملی

مری دفا کو تغافل کا ہو گیا دھوکا
اس احتیاط سے وہ چشمِ التفات ملی

جو زندگی کیلئے زہر بھی ہے امرت بھی
بڑے ریاض سے وہ تلخیٔ حیات ملی

جو بار بار گرے آگیا سنبھلنا بھی
ہزار لغزشوں پہ قوتِ ثبات ملی

جنوں کا دور بھی تم بھی ہو چاندنی بھی ہے
بہت دنوں پہ پھر ایسی حسین رات ملی

خود وہ آئے ہیں مجھکو سمجھانے
حال کیا کر دیا یہ دنیا نے

تنکا تنکا جلا نشیمن کا
برق نے کیا کیا خدا جانے

تیری یادوں کے درمیاں غمِ دہر
جیسے آبادیوں میں ویرانے

نہیں کھاتے فریبِ ہوش کبھی
کتنے ہشیار ہیں یہ دیوانے

جب نہ سلجھی حیات کی گتھی
ہم لگے زلفِ یار سلجھانے

نہ بجھے پیاس یوں بھی ہوتا ہے
لب تک آجائیں لاکھ پیمانے

چشمِ نم میں گھُلی ہوئی مستی
جیسے بھیگی فضا میں میخانے

رہ گئی بات دردِ پنہاں کی
فرصتِ غم نہ دی تمنا نے

اس سے پوچھو ہے کیا تبسّمِ یار
جو اسے حاصلِ وفا جانے

مرگِ اُمید کی گراں جانی
شاد کامِ حیات کیا جانے

دی نہ مہلت نظر جمانے کی
جوشِ نیرنگیٔ تماشا نے

ناز خود مائلِ کرم تھا آج
مجھ کو مارا نیازِ بیجا نے

جو لرزتا ہو خوفِ طوفاں سے
کون ایسے کو ناخدا جانے

چاند اڑنے لگے فضاؤں میں
نئی راہیں لگیں نظر آنے

ہو جو ہر لمحہ دارِ شوق پہ قتل
زندگی اس کی کوئی کیا جانے

دل ہے پھر ترکِ عشق پہ مائل
بھیس بدلا ہے کس تمنا نے

جو ہر نفس میں ترا انتظار کر نہ سکے — علاجِ گردشِ لیل و نہار کر نہ سکے

بہ قیدِ ہوش کبھی راہِ حیات ممکن تھی — مگر وہ اہلِ جنوں اختیار کر نہ سکے

کبھی کبھی تو تری یاد میں ملا وہ سکوں — کہ دردِ ہجر پہ ہم اعتبار کر نہ سکے

اشارہ پاتے ہی اشکوں کو روکنا ہی پڑا — خیالِ دیدۂ خونابہ بار کر نہ سکے

تڑپ کے سرد ہوئی جا رہی ہے نبضِ جنوں — وہ موجِ خوں جسے نذرِ بہار کر نہ سکے

نگاہِ دوست سے بھی ایسے زخمِ دل پہ لگے — شکایتِ ستمِ روزگار کر نہ سکے

کلی کلی میں تھی پوشیدہ رنگ و بو بن کر — خزاں پرست تلاشِ بہار کر نہ سکے

حقیقتِ غمِ دل کیا کسی کو سمجھاتے — کہ اشک و آہ سے بھی آشکار کر نہ سکے

سمجھ میں آ نہ سکا نقصِ مدعا طلبی — تری نگاہ کو ہم سازگار کر نہ سکے

ترے خیال کی آسودگی میں گم ہو کر — تجھے تلاش ترے بے قرار کر نہ سکے

چلے جو اُن کی طرف ساتھ بے خودی کو لیا — ہم اپنے ہوش کو بھی رازدار کر نہ سکے

○

محویتِ خیال میں گم انتظار ہے — اب میرے بس میں گردشِ لیل و نہار ہے

جیسے کہیں سے دولتِ کونین مل گئی — کتنا حسین وعدۂ بے اعتبار ہے

خود اپنی آرزو نے پہنائی ہیں بیڑیاں — جو دل میں ہے وہ کہنے پہ کب اختیار ہے

دونوں کی ایک ساتھ تسلی نہ ہو سکی — مجھ کو قرار ہے تو کوئی بے قرار ہے

ک گردشِ دوام ہے ذروں کی زندگی — کیسا کھلا فریبِ خیالِ قرار ہے

کثر تو یہ بھی دیکھ لیا میری فکر نے — فرقِ خزاں پہ سایۂ زلفِ بہار ہے

بجھتے رہے چراغ تمنا ڈاہ کے یہاں — پر کیا کروں مجھے اسی دنیا سے پیار ہے

ادت سی ہو گئی ہے وگرنہ ترا قرار — کھقا اعتبار پہلے نہ اب اعتبار ہے

ے آشیاں چھپائے کلیجے میں شوق سے — کس کو نصیب دولتِ برق و شرار ہے

کلا ہوں تیری بزم سے یہ سوچتا ہوا — تیری شرابِ چشم میں کس کا خمار ہے

جانے کدھر بھٹک کے سویرا چلا گیا

اب تک فضا میں ظلمتِ شب کا غبار ہے

○

آشنائے لذتِ دردِ فراواں کر دیا
عمر بھر کی بے خودی کا تم نے ساماں کر دیا

جب نہ صحرا کی اجازت دی جنونِ شوق نے
میں نے گھر کے گوشے گوشے کو بیاباں کر دیا

اے مٹانے والے اس کا ذوقِ بربادی نہ پوچھ
جس نے خود اپنا سفینہ نذرِ طوفاں کر دیا

محوِ سیرِ گُل ادھر بھی آ کہ آئی ہے بہار
خون دے کر میں نے صحرا کو گلستاں کر دیا

چپ تھا آزردہ سمجھ کر میں کہ اُس نے ناگہاں
مسکرا کر میری بربادی کا ساماں کر دیا

میں تو ہر طرح ہو چکا برباد
اب محبت تباہ ہوتی ہے

○

طوافِ شمع کو پروانہ آیا | فرازِ عشق پہ دیوانہ آیا
جہاں دل کی صدا بھی رک رہی تھی | وہاں ہو کر تیرا دیوانہ آیا
ہٹا لو جامِ مے یارانِ محفل | خیالِ نرگسِ مستانہ آیا
تلاشِ گُل میں آنکلے کہاں ہم | نظر ویرانہ ہی ویرانہ آیا
مصائب میں کبھی اکثر میرے لب پر | شکستِ درد کا افسانہ آیا
طلسمِ رنگ و بُو لوٹا پڑا ہے | یہ کس عالم میں اک دیوانہ آیا
ہمیں اسرارِ ہستی کی خبر کیا | وہ دیکھو ناصحِ فرزانہ آیا
قدم اٹھتے نہیں دل کھنچ رہا ہے | سوادِ کوچۂ جانانہ آیا
ادب سے دیکھتے ہیں اہلِ محفل | خرابِ شیشہ و پیمانہ آیا
پہونچ کر شمع تک خود بن گیا شمع | برنگِ شعلۂ اک پروانہ آیا

○

وہ دیکھ بھی لیتے ہیں نظر سب کی بچا کر | پھر بھی مری آشفتہ نگاہی ہے باقی

○

کچھ ایسی ہی گذری تھی کہ خوں ہوگیا دل بھی
آنکھوں کو لہو رونے کا ارماں تو نہیں ہے

اے ضبط! جو کر دیتا ہے زخمی دل و جاں کو
چہرے سے مرے غم وہ نمایاں تو نہیں ہے

روشن نہ سہی صبحِ وطن اے دلِ پرشوق
بے رونقیِ شامِ غریباں تو نہیں ہے

ہے یورشِ آلام کبھی احساسِ سکوں بھی
کشتی کو سنبھالے ہوئے طوفاں تو نہیں ہے

اک یاد بہاریں لئے آجاتی ہے اکثر
دل کا چمن اتنا ابھی ویراں تو نہیں ہے

کس طرح بڑھے قیمتِ خونِ دلِ پرشوق
آنسو ہیں ترا گوشۂ داماں تو نہیں ہے

طے کرلیں اسے بھی تو کہیں سایہ میں دم لیں
اے شوق کوئی اور بیاباں تو نہیں ہے!

کیا جانیے کب راہ پہ لے آئے انھیں بھی
میرے ہی لئے گردشِ دوراں تو نہیں ہے

کیوں کر کہوں کہ قرب ترا بے اثر رہا
لیکن غمِ فراق کی لذت ہی اور ہے

ظاہر نہ کرسکا میں اسے اشک و آہ سے
اے دوست میرے غم کی حقیقت ہی اور ہے

یقیں کے بھیس میں وہم و گماں کبھی ہوتے ہیں

پیمبروں میں کچھ افسانہ خواں کبھی ہوتے ہیں

قریب و دُور کی نیرنگیاں نہ پوچھ اے دوست

مکیں دلوں کے نظر سے نہاں بھی ہوتے ہیں

ہزاروں درد کے پہلو نکال لیتا ہوں

جو بھول کر وہ کبھی شادماں بھی ہوتے ہیں

بتاؤں کیا تجھے لذت خراب رہنے کی

کچھ ایسے غم ہیں جو آرامِ جاں بھی ہوتے ہیں

اب وہ ہیں اور مرکزِ صد جشنِ آرزو — پچھتائے تیری زلفِ پریشاں سنوار کے

ان کو بھی اپنی کاکلِ شب گوں میں دے جگہ — لایا ہوں آسماں سے ستارے اتار کے

جذبۂ ترکِ عشق کے پیچھے

ذوقِ بربادئ حیات نہ ہو

آج بے حد اُداس ہے دل

رائیگاں ان کا التفات نہ ہو

کیا نشاطِ گریز پا سے اُمید

جب ترے غم کو بھی ثبات نہ ہو

کیا نظر آئے ذات کا جلوہ

اگر آئینۂ صفات نہ ہو

کئی بار رونے میں ہنسنا پڑا ہے   کئی بار ہنستے ہوئے رو چکا ہوں

ہمیشہ سے یونہی نہیں تیرہ قسمت   میں زلفوں کے سائے میں بھی سو چکا ہوں

○

جب سے غم کا ہوا ہوں رمز شناس — یاس کرتی ہے بے قرار نہ آس
گئے وہ کب کے پھر بھی باقی ہے — گرمیِ پہلو کا دل نشیں احساس
کل تو خیر اُن کی یاد آئی تھی — آج کیوں ہے فضا اُداس اُداس
بھول جانے کی آرزو کیوں ہے — کیا محبت بھی ہے زمانہ شناس
تھا تمنّا بدوش میں بھی کبھی — آج کی زندگی پہ کر نہ قیاس
سخت ہے پر عزیز ہے کتنی — ہائے رے تلخ زندگی کی مٹھاس
اب کسی پہ بھی اعتماد نہیں — اِس طرح کوئی کر گیا بے آس
دل ابھی تھا کسی سے محوِ کلام — تم نہیں تھے اور کون تھا پاس
تجھ کو محرمِ رنگ و بو نہ کرم — نکہتِ یار کا ہوں رمز شناس

○

منتظر تیرے اسیرِ شبِ گیسو تیرے — ایسے کھوئے ہیں کہ افسونِ سحر یاد نہیں

○

یہ یاد ہے کہ کبھی دل میں آگ بھڑکی تھی — پھر اس کے بعد دھواں ہی دھواں نظر آیا
بچا لیا تھا کلیجہ سبھی حوادث سے — وہ تیرِ عشق تھا جو بے اماں نظر آیا
لئے بہار کی رعنائیاں نگاہوں میں — وہ فرق تا بہ قدم گلستاں نظر آیا
جسے بہار نے اپنے لہو سے پالا تھا — وہ گل کبھی نذرِ جفائے تباں نظر آیا
سمجھ لوں کیسے کہ منزل پہ آگیا انساں — کہ کارواں ہی پسِ کارواں نظر آیا
دراز ہیں تری زلفیں یہ مانتا ہوں مگر — دراز اس سے کبھی کارِ جہاں نظر آیا
شبِ فراق کی سرد اور سیاہ راتوں میں — کسی خیال سے دل شادماں نظر آیا
جھکائے سر سرِ رہ ایک نقشِ پا کے قریب — خرابِ شوق نہ پوچھو کہاں نظر آیا

قریب و دور کی نیرنگیاں فریبِ خرد — وہ دور رہ کے کبھی مجھ سے بہت قریب رہے

یاد میں تیری مہ و مہر پہ جاتا ہے خیال
یہ کبھی آوارگیٔ قلب و نظر ہے کہ نہیں
تم بچائے ہوئے نظریں جو گذر جاتے ہو
کوئی افسردہ سرِ راہگذر ہے کہ نہیں
تیرِ آلام و حوادث نے چلائے کتنے
جی رہا ہوں ترا غم سینہ سپر ہے کہ نہیں

ہم نشیں تو ہی نہیں مائلِ فریاد ابھی
ورنہ برباد ہو یہ عالمِ اضداد ابھی
وہ جنوں خیز خیالات ہیں سینے میں نہاں
لب تک آئیں تو زباں کاٹ لے صیاد ابھی
اور ہو لینے دے کچھ خون تمناؤں کا
مجھ سے مت پوچھ مرے شوق کی روداد ابھی

اُن آنکھوں کو نظر کیا آ گیا ہے — مزاجِ آرزو بدلا ہوا ہے

نہ جانے ہار ہے یا جیت کیا ہے — غموں پر مسکرانا آ گیا ہے

مری حالت پہ اُن کا مسکرانا — جوابِ نامرادی بن گیا ہے

نہیں اک میں ہی انجامِ محبت — یہی پہلے بھی اکثر ہو چکا ہے

صبا کی رو، نہ غنچوں کا تبسم — چمن والو! کہو کیا ماجرا ہے

شبِ غم سہمی سہمی یاد اُن کی — اندھیرے میں دیا سا جل رہا ہے

نہیں ملتا سراغِ منزلِ شوق — محبت سے کبھی جی گھبرا گیا ہے

سرفروشانِ غم کے کوچے میں — موت بن کر حیات آئی ہے

کوئی ہوتا نہیں تمہارے سوا — جب کبھی غم کی رات آئی ہے

حسن نازاں ہے جب تغافل پر — عشق کو بھی وہ بات آئی ہے

یاد میں تیری کٹ ہی جاتی ہے
ہجر کی رات بے سحر تو نہیں

"اب تک آنسو پیئے تو کیا پایا"
اتنا کہنے میں کوئی ڈر تو نہیں

پوچھ لو جا کے کج کلاہوں سے
جو جھکا تھا وہ میرا سر تو نہیں

پھرا کے منہ وہ نگاہیں چرائے جاتے ہیں
حیاتِ شوق کے لمحے بڑھائے جاتے ہیں

کسی طرح رگ رگ و پے میں سمائے جاتے ہیں
وہ دور رہ کے بھی نزدیک آئے جاتے ہیں

وہ چاہتے ہیں کہ رگ رگ میں بجلیاں بھر دیں
نظر ملا کے جو یوں مسکرائے جاتے ہیں

غم میں اک موج سرخوشی کی ہے — ابتدا سی خود آگہی کی ہے

کیسے سمجھائیں کون مانے گا — جیسے مر مر کے زندگی کی ہے

بجھیں شمعیں تو دل جلائے ہیں — یوں اندھیروں میں روشنی کی ہے

پھر جو ہوں اس کے در پہ ناصیہ سا — میں نے اے دل تری خوشی کی ہے

میں کہاں اور دیارِ عشق کہاں — غمِ دوراں نے رہبری کی ہے

اور اُمڈے ہیں آنکھ میں آنسو — جب کبھی اس نے دلدہی کی ہے

قید ہے اور قیدِ بے زنجیر — زلف نے کیا فسوں گری کی ہے

میں شکارِ عتاب ہی تو نہیں — مہرباں ہو کے بات بھی کی ہے

بزم میں اس کی بار پانے کو — دشمنوں سے بھی دوستی کی ہے

ان کو نظروں میں چھپا کے دیکھا ہے — خوب چھپ چھپ کے میکشی کی ہے

ہر تقاضائے لطف پر اس نے — تازہ رسمِ ستمگری کی ہے

کوئی تو بات تھی اہلِ جنوں کے تیور میں
اٹھی ہیں سب کی نگاہیں جہاں سے گزرے ہیں
لئے ہوئے تری یادوں کے مہر و ماہ و نجوم
اسی زمین پہ ہم آسماں سے گزرے ہیں
یقیں کی منزلِ پُر خار تک پہونچنے میں
ہزار محشرِ وہم و گماں سے گزرے ہیں
ندیم پوچھ نہ اس وقت کیفِ سرشاری
دیارِ کاکلِ عنبر فشاں سے گزرے ہیں

○

کیوں یورشِ طرب میں بھی غم یاد آگئے
سوچا ترے کرم کو ستم یاد آگئے

اے دوست! میکدے میں یہ کیسی ہوا چلی
سب فتنہ ہائے دیر و حرم یاد آگئے

روشن ابھی ہُوا تھا سرِ جادۂ حیات
اک کاکُلِ سیاہ کے خم یاد آگئے

اب کیا دکھا رہا ہے رہِ ماہ و کہکشاں
ناصح! کسی کے نقشِ قدم یاد آگئے

اک ایک کر کے ٹوٹ چکے ہیں خرد کے بت
بُت خانۂ جنوں کے صنم یاد آگئے

○

تدبیر کی ہر راہ جو مسدود ہوئی ہے
یہ اپنے ہی افکار کی بیدادگری ہے

وہ شرم سے بے خود ہے نگہ دیکھ رہی ہے
اے ذوقِ نظارہ یہ بڑی بے ادبی ہے

کوشش میں بھلانے کی اسے کرتے رہے ہیں
کیا سعیٔ زبوں کاوشِ دردِ طلبی ہے

افسردگی و یاس کی منزل سے گذر کر
امیدِ حیاتِ ابدی ڈھونڈھ رہی ہے

اک گردِ کدورت کی چھپا لیتی ہے چہرہ
آندھی کوئی صحرائے محبت میں اٹھی ہے

کس شوق سے اٹھتے ہیں قدم راہِ طلب میں
ملنے کی ہو امید تو ہر راہ نئی ہے

سو بار انھیں دیکھ کے پھر دیکھنے کی پیاس
آسودہ ہے دل جس سے یہ وہ تشنہ لبی ہے

تخلیق کا ہر ذرہ ہے اب گوش بر آواز
فطرت ترے کس راز کے کھلنے کی گھڑی ہے

مٹتا ہے کوئی شوقِ فراواں کا تقاضا
یہ شمع کئی بار جلی اور بجھی ہے

بچا کے سب کی نظر جس سے دیکھتے ہو مجھے
ہزار طرح کی لذت [illegible] نگاہ میں ہے

وہی جو معنیِ سود و زیاں سمجھتے ہیں
متاعِ درد کو آزارِ جاں سمجھتے ہیں

فریب کھاتے رہے ہیں تو کیا مگر ہمدم
فسوں طرازیٔ چشمِ بتاں سمجھتے ہیں

وہ لمحہ جس میں محبت کی اک کرن مل جائے
اسی کو اہلِ نظر جاوداں سمجھتے ہیں

جہاں ملیں ترے نقشِ قدم کے ماہ و نجوم
اسی زمین کو ہم آسماں سمجھتے ہیں

حکایتِ غمِ ہستی کہیں تو کس سے کہیں
کہاں وہ لوگ جو دل کی زباں سمجھتے ہیں

جنھیں نصیب نہیں دولتِ سکون و قرار
بھری بہار کو بھی وہ خزاں سمجھتے ہیں

رہِ وفا میں ستم یوں بدل کے بھیس آئے
کہ ہم کرم کو بھی اب امتحاں سمجھتے ہیں

انھیں ملی ہی نہیں لذتِ الم شاید
حیاتِ عشق کو جو رائگاں سمجھتے ہیں

زمانہ کیسے ہو ہموار بن نہیں پڑتا
ہزار معنیٔ سود و زیاں سمجھتے ہیں

دکھا کے جلوۂ رنگِ چمن فریب نہ دو
ہم امتیازِ بہار و خزاں سمجھتے ہیں

○

عقل منزل کا پتہ دیتی ہے
دل کہیں دور لئے جاتا ہے
نہ کرو رات کے کٹنے کی دعا
اس کی زلفوں کا خیال آتا ہے

○

عشقِ مغرور شرمسار ہوا　　اُن سے آج عرضِ مدعا کر کے
ہنس کے میں نے جو ہر بلا جھیلی　　خود وہ شرما گئے جفا کر کے
کام لاؤ حیات ہی سے لیں　　تھک گئے موت کی دعا کر کے
وہ جفاؤں سے ہاتھ اٹھاتے ہیں　　لذتِ غم سے آشنا کر کے
ناؤ طوفاں میں ڈال دی میں نے　　عشق کو اپنا رہنما کر کے

○

(بہ یادِ ویت نام)

پھر خون میں غرق ہیں فضائیں — کیونکر غمِ زندگی بھلائیں
پھر ناوکِ ظلم سر ہوا ہے — سینوں کو چلو ہدف بنائیں
ہر سمت محیط سوزِ غم ہے — کب تک اسی آگ میں نہائیں
برہم ہے مزاجِ زندگانی — پھر آؤ جنوں کے گیت گائیں
جاں بازِ الم ہیں ہم سے پوچھو — جھیلیں کس شان سے بلائیں
نکلیں گے تو سرخرو رہیں گے — سیلابِ بلا میں ڈوب جائیں
شل ہو گئے دستِ ظلم آخر — کہتے تھے نہ ہم کو آزمائیں
ہم سنگِ گرانِ زندگی ہیں — ممکن ہو تو راہ سے ہٹائیں
نکلا جو ترے خیال کا چاند — چھانے لگیں درد کی گھٹائیں
آئی دبے پاؤں یاد کس کی — اوڑھے ہوئے خواب کی ردائیں

وہ آئے نہ مجھکو نیند آئی | روتی رہیں رات بھر ہوائیں
کیا گزرے جو وہ اچانک جائیں | کیا ہو جو نصیب جاگ جائیں
کچھ بھی تو نہیں ہے اپنے بس میں | یاد اُن کو کریں کہ بھول جائیں
شعلے بھی تو پھول بن چکے ہیں | زخموں سے کہو کہ مسکرائیں

جس کو ان سے بھی چھپایا تھا وہ زخم
آج اک دنیا کو دکھلانا پڑا
مُسکرا کے آ گئے وہ سامنے
اپنی بیتابی پہ شرمانا پڑا
وائے مجبوری محبت کا چراغ
آندھیوں کی زد پہ پھر لانا پڑا

ہر چند وقفِ جور و جفائے بتاں رہے
ناموسِ عاشقی کے ہمیں پاسباں رہے

رک رک گئی ہے ضربِ دلِ کائنات کی
ہم یوں غمِ حیات کے افسانہ خواں رہے

دھوکا دیا تری نگہِ احتیاط نے
اب منفعل ہیں تجھ سے جو یوں بدگماں رہے

غم بے نیازِ گردشِ ایام تو نہیں
پھر کیا ہوا جو ہم کوئی دن شادماں رہے

خود اپنی آرزو کا بھرم مجھ پہ کھل گیا
نامہرباں ہو کے کبھی وہ مہرباں رہے

لو دے رہا تھا زخمِ تمنا کا ہر چراغ
اچھا ہوا وہ بزم میں دامن کشاں رہے

صحرائے آرزو کے گل و یاسمن ہیں در
کیوں غم کریں بہار رہے یا خزاں رہے

کیوں چارہ سازو! ایسے کبھی غم کا علاج ہے
جو درد بن کے ہر رگ و پے میں نہاں رہے

آزادیوں کے دل ہیں کھلاتے رہے چمن
گو ہم اسیرِ دامِ زمان و مکاں رہے

یادوں کے خار و گل ہیں وہ سرمایۂ حیات
جو بے نیازِ جبرِ بہار و خزاں رہے

اے دورِ بندگی کبھی وہ دن کبھی آئے گا
داغِ جبیں نہ سنگِ درِ آستاں رہے

محشر طراز تھیں تری نازک خرامیاں
برہم نہ کیسے نظمِ زمان و مکاں رہے

گر تقاضائے جنوں خام نہ ہو　　کاوشِ عقل کبھی بدنام نہ ہو

عشق کا بھی تو بھرم رکھنا ہے　　حُسن کا بندۂ بے دام نہ ہو

کتنے دھبے ہیں ریاکاری کے　　شیخ کا جامۂ احرام نہ ہو

ہوں گرفتارِ بہارِ گلشن　　یہ بھی صیاد ہی کا دام نہ ہو

عشق پر ناز نہ کر اے ہمدم　　کہیں میرا ہی سا انجام نہ ہو

اک کرن چھوتی ہے دل کو اکثر　　خلشِ دستکِ الہام نہ ہو

کفر و اسلام پہ لڑنے والو　　یہ فقط دُوریٔ یک گام نہ ہو

جی نہ کھو جلد بہار آئے گی　　صبح کب ہو گی اگر شام نہ ہو

رہِ الفت میں لرزتے ہیں قدم　　شوق کتنا ہی سبک گام نہ ہو

کیا خبر ہو کہ نہ ہو وعدہ وفا　　سرخوشی لذتِ پیغام نہ ہو

چھیڑ تو دوں میں کہانی دل کی　　محفلِ دوست میں کہرام نہ ہو

دیکھتے ہی نظر ہٹا لینا اب یہی التفات ہے شاید

لب پہ حرفِ رِیا جبیں پہ شکن ناصحِ خوش صفات ہے شاید

اب تو احساس بھی نہیں ہوتا یہی غم سے نجات ہے شاید

نہیں کٹتی تو کیا سکون تو ہے تیری زلفوں کی رات ہے شاید

کچھ نہ کچھ ہو رہے گا یہ احساس اک فریبِ حیات ہے شاید

سایہ افگن ہیں ظلمتیں حق پر دورِ لات و منات ہے شاید

پی گئی جو نئی سحر کا لہو بے یقینی کی رات ہے شاید

تہہ سے اوپر ابھار لائی ہے موجِ بحرِ حیات ہے شاید

کیوں گھستے ہو اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر بلب جلاؤ

دیکھو اور کے پاس نہ جاؤ

شمع جلے گی رات کو پھر پروانوں کی لاش اٹھاؤ

اپنے کئے پہ مت شرماؤ

نہ تلافیٔ جفا ہے، نہ ستائشِ وفا ہے
ترے شہر ہی سے شاید یہ رواج اٹھ گیا ہے

جسے گوشِ شوق میرا اسیرِ بزم سُن رہا ہے
تری چشمِ ملتفت کی وہ نوائے بے صدا ہے

ترے دل پہ منحصر ہے الم اور خوشی کی لذّت
کبھی موت بھی ہے شیریں کبھی زہر بھی دوا ہے

نہ خبر کہ کس جگہ ہوں، نہ پتا کہ کیا ہے منزل
کہیں راہِ جستجو میں مرا خواب کھو گیا ہے

جسے بیمِ جاں سے اب تک نہ کیا تھا طے کسی نے
اسی خارزارِ غم میں مرا دل برہنہ پا ہے

نہ ملی کسی کو اب تک رہِ کفر و دیں میں منزل
جو سزا ہے گمرہی کی وہ یقیں کی جزا ہے

نہ لہک نہ تازگی ہے نہ نمو نہ زندگی ہے
مری کشتِ آرزو میں کوئی زہر بو گیا ہے

کہہ دو ساحل کے سبک ساروں سے
ڈوب جاتے ہیں کنارے بھی کبھی

شب کی تاریک فضا کہتی ہے
کام آتے ہیں ستارے بھی کبھی

آدمی باقی ہے ہو ٹوٹا [illegible] اب
وہ اگر ہنس کے پکارے بھی کبھی

○

دیارِ آرزو میں جب کوئی مشکل مقام آتا — لبِ گلرنگِ ساقی پر فقط میرا ہی نام آتا

بدل جاتا نظامِ میکشی گردش میں جام آتا — اگر رندوں کے بس میں میکدے کا انتظام آتا

ہوا مجروح ایک اک بات پر احساسِ خودداری — کسی دن تو تری محفل سے یہ دل شاد کام آتا

خیالوں کا افق روشن رہا یوں ایک مدت تک — کوئی خورشید رہ جاتا کوئی ماہِ تمام آتا

وہ دن بھولے نہیں جب خوفِ رسوائی سے بچ بچ کر — تغافل کے حجابوں میں چھپا تیرا پیام آتا

کٹی جاتی ہے بے طوفاں حیاتِ واعظِ خود بیں — کبھی محفل میں کاش اس کی کوئی محشر خرام آتا

خرد والو جنوں میں کامیابی تو یقینی تھی — بہت ہوتا تو یہ ہوتا خرد پر اتہام آتا

یقیں کو کاوشِ سعی و عمل کی داد مل جاتی — اگر یہ طائرِ وحشی جنوں کے زیرِ دام آتا

دیا ہوتا نہ دھوکا گر ضیائے صبحِ کاذب نے — سحر کا قافلہ کیوں راہِ شب میں سست گام آتا

○

زمیں سے عشق ہے انساں سے پیار کرتے ہیں — متاعِ شوق انہیں پر نثار کرتے ہیں

○

عقل پہونچی جو روایات کے کاشانے تک
ایک ہی رسم ملی کعبہ سے بت خانے تک

وادیٔ شب میں اُجالوں کا گذر ہو کہ نہ ہو
دِل جلائے رہو پیغامِ سحر آنے تک

یہ کبھی دیکھا ہے کہ ساقی سے ملا جام مگر
ہونٹ ترسے ہوئے پہونچے نہیں پیمانے تک

ریگ زاروں میں کہیں پھول کھلا کرتے ہیں
روشنی کھو گئی آکر مرے ویرانے تک

ہم نشیں کٹ ہی گیا دورِ خزاں بھی آخر
ذکر پھولوں کا رہا فصلِ بہار آنے تک

ساری اُلجھن ہے سکوں کیلئے اے شوق ٹھہر!
غم کا طوفانِ بلاخیز گذر جانے تک

ذہن مایوسیٔ کرم، شوقِ نظارہ سرشار
ہوش میں کیسے رہوں اُن کا پیام آنے تک

زخم یادوں کے مہکتے ہیں کہ آئی ہے بہار
ہے یہ دولت غمِ دوراں کی خزاں آنے تک

بے نیازی ہے تغافل ہے کہ بیزاری ہے
بات اتنی تو سمجھ لیتے ہیں دیوانے تک

زندگی غم سے اُلجھتی ہی رہے گی ہمدم
وقت کی زلفِ گرہ گیر سلجھ جانے تک

منزلِ راہِ طلب تھی تو کہیں اور مگر
رُک گئے خود ہی قدم پہونچے جو میخانے تک

○

شیخِ حرم کا ذکر نہ ہے برہمن کی بات
میری حدیثِ شوق ہے اور کوہکن کی بات

ہنستا ہوں سن کے گردشِ چرخِ کہن کی بات
کتنی خرد فریب ہے دیوانہ پن کی بات

آشفتگی بڑھے تو بڑھے لیکن اے ندیم
ہو ساری رات زُلفِ شکن در شکن کی بات

میزانِ غم پہ تول رہا ہوں حیات کو
لگتی نہیں ہے دل کو گل و یاسمن کی بات

سرگشتۂ حیات کی تقدیر بن گئی
اک دن جو کر گئے مرے دیوانہ پن کی بات

سرگشتۂ حیات ہوں مجھ کو نہ یوں سناؤ
تاراجیٔ بہار کی، اجڑے چمن کی بات

اک ناوکِ طرب، دلِ غم سے گذر گیا
آئی جو یاد اس نگہِ سحرفن کی بات

وہ بزمِ ناز اور وہ تنہائیاں مری
خلوت میں یاد آئی تری انجمن کی بات

اہلِ خرد نے بات کو افسانہ کر دیا
اظہارِ شوق بن گیا دیوانہ پن کی بات

غربت میں بھی حسین نظاروں کا لطف تھا
لیکن کچھ اور ہی تھی نگارِ وطن کی بات

پھولوں کے رنگ اڑ گئے نکہت بہار کی
آئی جو درمیاں میں ترے پیرہن کی بات

دیتا ہوں خوں کا قطرۂ آخر بھی یا نہیں
دیکھو تو مجھ سے کر کے فروغِ وطن کی بات

مقتول ہوں صلیبِ غمِ کائنات کا
جچتی نہیں نگاہ میں دار و رسن کی بات

دیکھا کئے وہ اور مرا آشیاں جلا
نکلے گی کیسے دل سے یہ اہلِ چمن کی بات

محفلِ دوست میں گو سینہ فگار آئے ہیں
صورتِ نغمہ باندازِ بہار آئے ہیں

اس نظر سے کہ ترے ظلم کی تشہیر نہ ہو
بیقراری میں لئے دل کا قرار آئے ہیں

ایک پندارِ خودی جس کو بچا رکھا تھا
آج ہم وہ بھی تری بزم میں ہار آئے ہیں

ظلمتِ شامِ خزاں یاد کرے گی برسوں
ہم جب آئے ہیں گلستاں بکنار آئے ہیں

گوشۂ دل میں جلائے ہوئے زخموں کے چراغ
داد خواہی کو ترے سینہ فگار آئے ہیں

اے رفیقانِ رہِ شوق کہاں ہو بولو
تم کو ہم شہر و بیاباں میں پکار آئے ہیں

ہے پر آشوب فضا پھر بھی کسی جانب سے
دل کے ویرانے میں پیغامِ بہار آئے ہیں

غمِ منزل میں بھٹکتے ہی گذر جاتی ہے
چھوڑ کر جب سے تری رہگذار آئے ہیں

زندگی روز نئی لگتی ہے دل والوں کو
گرچہ ہر بار وہی لیل و نہار آئے ہیں

دیکھنا لوٹ گئی کون سی بستی یارو
اُڑ کے دل تک جو کدورت کے غبار آئے ہیں

اپنے انجام سے خوش اپنی وفا پر نازاں
مسکراتے ہوئے ہم جانبِ دار آئے ہیں

خود ان کو تو کوئی فکرِ غمِ مآل نہیں
تمہیں بھی اپنے اسیروں کا کچھ خیال نہیں

لکھی گئی ہے لہو سے مرے حدیثِ وفا
دوامِ زیست کا جذبہ تو پائمال نہیں

بتا چکا ہوں کئی بار چارہ سازوں کو
سمجھ میں آئے جو اُن کے وہ دل کا حال نہیں

یہ دکھ ہے کیسی بجھی جا رہی ہے دل کی آگ
خیالِ ترکِ وفا کا کوئی ملال نہیں

دیا ہے تم نے کہ میں نے دیا ہے خود کو فریب
بجھا ہے دل تو کسی بات کا خیال نہیں

جواب وجہِ تسلّی نہ ہو تو کیا حاصل
نہ تم سنو تو کسی سے مرا سوال نہیں

علاج درد کا ہم درد ہی سے کرتے ہیں
اسی لئے تو غمِ زندگی وبال نہیں

سدا بہار جراحت کی لالہ کاری ہے
کہا یہ کس نے غمِ ہجر لازوال نہیں

ہوئے ہیں عشق کی دنیا میں واقعات بہت
مرے جنوں کی، ترے حسن کی مثال نہیں

شبِ ستم میں رہا ہوں نقیبِ حسنِ سحر
سحر یہ بھول گئی ہے تو کچھ ملال نہیں

سمجھ سکتا نہیں کس طرح بجلی کوند جاتی ہے
تری نظروں کو جس نے ناگہاں اٹھتے نہیں

کیا روئے وطن پہ بانکپن ہے ۔۔۔ بھڑکا ہوا شعلۂ چمن ہے

گل چیں سے کہو کہ ہاتھ روکے ۔۔۔ بیدار گلوں کا بانکپن ہے

کس نے چھیڑا شعورِ غم کو ۔۔۔ پھر جوشِ حیات موجزن ہے

پھر چاند پہ ہیں گہن کی نظریں ۔۔۔ پھر رات سحر پہ خندہ زن ہے

راہیں سونی ہیں فکر و فن کی ۔۔۔ بے رنگ خیال کی کرن ہے

قسمت کس نے پلٹ دی آدمی کی ۔۔۔ پیشانئ وقت پر شکن ہے

یہ سارا جہانِ علم و حکمت ۔۔۔ تفسیرِ طلسمِ ما و من ہے

میں بادِ سحر کو کیا دعا دوں ۔۔۔ اجڑا اجڑا مرا چمن ہے

وہ نورِ سحر جو دل بجھا دے ۔۔۔ خود اپنے وجود کا کفن ہے

آنسو ہیں نہ خوں کہاں سے روؤں ۔۔۔ اک آگ رگوں میں شعلہ زن ہے

کیا سلجھے گی دستِ آرزو سے ۔۔۔ یہ زلفِ حیات کی شکن ہے

کونین پہ چھائی جا رہی ہے ۔۔۔ کس شوخ کی بوئے پیرہن ہے

تاریکئ ہجر کیا کہ دل میں ۔۔۔ مہرِ غمِ دوست ضو فگن ہے

سنکی ہے ہوائے یادِ ماضی ۔۔۔ ہر سازِ خیال نغمہ زن ہے

مدت سے بھٹک رہی ہیں یادیں ۔۔۔ کس دیس میں تیری انجمن ہے

رگوں میں غم کا لہو بن کے جو مچلتے ہیں — وہ گیت ہیں کہ مری شاعری میں ڈھلتے ہیں

یہ کس نے دیکھ لیا اجنبی نگاہوں سے — دیارِ دل میں امیدوں کے تیر چلتے ہیں

نئی ہیں پیچ و خمِ زیست کی گذرگاہیں — جنھیں گرایا تھا غم نے وہ اب سنبھلتے ہیں

وہ راہ جس پہ کئی بار بچھ چکیں لاشیں — اسی پہ روز نئے کارواں نکلتے ہیں

تلاشِ نور میں ظلمت بھی کام آتی ہے — خزاں کی گود میں نخلِ بہار پلتے ہیں

تری نگاہ جگاتی ہے شوق کا جادو — جو اک چراغ بجھے سو چراغ جلتے ہیں

کبھی تو مڑ کے انھیں دیکھ، پوچھ لے کوئی بات — جو دو قدم پہ ترے ساتھ ساتھ چلتے ہیں

حصارِ شوق کی ٹوٹی ہوئی فصیلوں پر — بجھے بجھے سے چراغِ آرزو کے جلتے ہیں

حال مرا اندوہ فزا ہے — کہہ دے کوئی اُن سے کہ نہ آئیں

اپنی وفا کا حال سنا کر — جی میں ہے اک دن اُن کو رلائیں

○

جینے کی خوشی نہ موت کا غم — ہے سوزِ یقیں کہ شعلۂ نم
کھولا ہے حیاتِ نو نے پرچم — کب تک بیتے دلوں کا ماتم
درماندگیٔ ستم سے پوچھو — سر میرا کبھی نہ ہو سکا خم
یوں عقل و جنوں ہیں مجھ میں یکجاں — گنگا جمنا کا جیسے سنگم
ناموسِ وفا کی پاسبانی — لے جاؤں کہاں یہ چشمِ پُر نم
جو زہرِ حیات پی رہا ہو — کیا اُس کے لئے ہے موت کا سم
ہر دورِ ستم میں آدمی نے — اونچا کیا سرکشی کا پرچم
ہے کتنی کڑی فراق کی دھوپ — شبنم، لطف و عطا کی شبنم!
جلتے ہوئے آرزو کے لمحو! — کیوں روشنیٔ حیات ہے کم؟
کہتا کہ خرد بھی کام کی ہے — ہوتا جو کوئی جنوں کا محرم

○

تلخ دونوں کی زندگی ہو جائے — اِس طرح سے نہ مجھ کو پیار کرو

○

○

رسم ہی شہرِ تمنّا سے وفا کی اٹھ جائے — اس طرح تو نہ کوئی اہلِ محبت کو ستائے

وادیٔ دل میں کئی راتوں سے سنّاٹا ہے — کاش بجلی ہی ترے ابرِ ستم سے گر جائے

اپنی ذلّت کی صلیب آپ لئے پھرنا ہے — یہ بڑا بوجھ محبت کے سوا کون اٹھائے

بر سرِ جنگ ہیں انوار سے ظلمات کے دیو — چاند راتوں کے اندھیرے میں کہیں ڈوب نہ جائے

یہ سمجھ لو کہ رگِ جاں میں ہے زہرابِ جنوں — جب نگاہِ کرم و لطف سے بھی دل دکھ جائے

دشتِ امید میں جلتا ہے مرے خوں کا چراغ — راہ منزل کی کہو میرے سوا کون بتائے

بارشِ سنگِ ملامت ہے خرد کا پتھراؤ — اپنے سر سے ہو جسے پیار مرے ساتھ نہ آئے

○

ربابِ عشق کے الجھے ہوئے تاروں کو سلجھاؤں

کسی گوشہ میں تنہا بیٹھ کر پھر اک غزل گاؤں

کہ ظلم و جور کے تیرِ ستم پر آگ برساؤں ؟

○

ہر ایک فکر سے میرا خیال اُلجھا ہے　　بڑی تلاش سے رمزِ حیات پایا ہے
ردائے ظلمتِ شب اوڑھ کر سحر نکلی　　کس ابرِ غم میں محبت کا چاند ڈوبا ہے
دلوں کے تپتے بیاباں میں پڑ گئی ٹھنڈک　　کس آسمان سے یہ آفتاب اُترا ہے
نگاہِ شوق کی پھر تشنگی بجھے نہ بجھے　　ہزار بار تجھے اک نظر میں دیکھا ہے
سمجھ کے آئے ہیں دشتِ جنوں میں دیوانے　　یہ جانتے ہیں وہ بستی ہے اور یہ صحرا ہے
یہ آج کیا ہے کہ پھر راستے نظر میں نہیں　　مرا وجود مری جستجو میں تنہا ہے
نہ تیرا ظلم گیا رائگاں نہ شوق مرا　　اسی لہو سے نیا آفتاب اُبھرا ہے
یہ گرد اُڑتی ہے یا مہر و مہ برستے ہیں　　وہ دیکھ اہلِ وفا کا جلوس نکلا ہے
شکستِ دل کو ستم بھی تو کہہ نہیں سکتے　　کسی نگاہِ کرم کا فریب کھایا ہے

میں دارِ ہجر پہ ہوتا ہوں قتل شام و سحر　　خود اپنے خون میں جب زندگی نہاتی ہے

ڈر ڈر کے جیسے میں سن رہا ہوں — کھوئی ہوئی اپنی ہی صدا ہوں

ہر لمحۂ ہجر اک صدی تھا — پوچھو نہ کہ کب سے جی رہا ہوں

جب آنکھ میں آ گئے ہیں آنسو — خود بزمِ طرب سے اُٹھ گیا ہوں

چھٹتی نہیں خوئے حق شناسی — سقراط ہوں، زہر پی رہا ہوں

رہبر کی نہیں مجھے ضرورت — ہر راہ کا موڑ جانتا ہوں

منزل نہ ملی تو غم نہیں ہے — اپنے کو تو کھو کے پا گیا ہوں

اپنی ہی ہوس تھی سر کشیدہ — دامن سے الجھ کے گر پڑا ہوں

عریانیٔ فکر کھل نہ جائے — خوابوں کے لباس سی رہا ہوں

ہر منزلِ مرگ آفریں میں — سرگشتۂ زندگی رہا ہوں

دستے ہیں بہت سے تیرگی کے — کن روشنیوں میں گھِر گیا ہوں

○

تجھے پسند جو دل کی لگن نہیں آئی — مجھے بھی راس تری انجمن نہیں آئی

اڑا سا رنگ ہے کیوں وقت کے مسیحاؤ — ابھی تو منزلِ دار و رسن نہیں آئی

چمن کا رنگ کھلے کیا کہ باغبانوں کو — نگاہ داریٔ سرو و سمن نہیں آئی

کہاں ہے قافلۂ نو بہار دیکھ تو لو — کسی طرف سے بھی بوئے سمن نہیں آئی

تڑپتا ہی رہا یعقوبِ دار عہدِ کہن — ہوائے یوسفِ گل پیرہن نہیں آئی

ستم شعار تو تھا غیر بھی مگر اس کو — جفا طرازئ اہلِ وطن نہیں آئی

جو دھوپ بن کے چمک جاتی دل کے آنگن میں — تری نظر کی وہ رنگیں کرن نہیں آئی

جو پیش خیمہ بنے انقلاب کا اب تک — جبینِ وقت پہ ایسی شکن نہیں آئی

○

وہ ملے مجھے اب نہیں ملتے کبھی — زندگی سے پیار بھی نفرت بھی ہے

○

○

کچھ مرے شوق نے در پردہ کہا ہو جیسے — آج تم اور ہی تصویرِ حیا ہو جیسے

یوں گذرتا ہے تری یاد کی وادی میں خیال — خارزاروں میں کوئی برہنہ پا ہو جیسے

سازِ نفرت کے ترانوں سے بہلتے نہیں کیوں — یہ بھی کچھ اہلِ محبت کی خطا ہو جیس

وقت کے شور میں یوں چیخ رہے ہیں لمحے — بہتے پانی میں کوئی ڈوب رہا ہو جیس

کیسی گلرنگ ہے مشرق کا افق دیکھ ندیم — دن کا خوں رات کی چوکھٹ پہ بہا ہو جیس

یا مجھے وہم ہے سنتا نہیں کوئی میری — یا یہ دنیا ہی کوئی کوہِ ندا ہو جیس

بحرِ ظلماتِ جنوں میں بھی نکل آئی ہے راہ — عشق کے ہاتھ میں موسیٰ کا عصا ہو ج

دل نے چپکے سے کہا کوششِ ناکام کے بعد — زہر ہی دردِ محبت کی دوا ہو ج

دیکھیں بچ جاتی ہے یا ڈوبتی ہے کشتیِ شوق — ساحلِ فکر پہ اک حشر بپا ہو ج

○

یقینِ عشرتِ فردا نہیں تو کچھ بھی نہیں — نظر میں صبح کا جلوہ نہیں تو کچھ بھی ن

○

○

تلاشِ گل میں نکل آئے گھر سے دیوانے
جھلک کچھ ایسی دکھائی غبارِ صحرا نے

نہ دردِ زیست نہ حسنِ نظر نہ ذوقِ جمال
جنوں کے بھی نہ ہوئے کچھ خرد سے بیگانے

حصارِ عہد سے باہر بھی گونج جاتے ہیں
حدودِ وقت میں لکھے گئے جو افسانے

انھیں سُلا دو پلا کر شرابِ کم نظری
کہ سنگ و خشت سے رُکتے نہیں یہ دیوانے

حقیقتوں نے جو رکھا شکارِ تشنہ لبی
تصورات میں چھلکا کیے ہیں پیمانے

وفا کی فصل اُگے گی اس اک تمنا میں
لہو سے سینچ رہا ہوں دلوں کے ویرانے

سکوں عجیب یہ آشوبِ آگہی سے ملا
خود اپنے ہی سے نظر آ رہے ہیں بیگانے

سبھی حدود زمان و مکاں کے ٹوٹ گئے
تمہارے پاس ہی رکھا اُمیدِ فردا نے

○

جب ترا غم بھی ساتھ دے نہ سکا
مجھ پہ گزری ہیں ایسی راتیں بھی

○

دل تری یاد میں ہر لمحہ تڑپتا بھی نہیں — بند ہو جائے تڑپنا یہ گوارا بھی نہیں

وہ نہیں پاس تو احساسِ رفاقت ہے سوا — غمِ تنہائی کے زنداں میں مَیں تنہا بھی نہیں

دشت دیوانوں سے آباد ہوئے جاتے ہیں — اب تو جاگیر کسی قیس کی صحرا بھی نہیں

سنگِ دشنام برستے رہے ہر جانب سے — سخت دار، دل ہی کچھ ایسا تھا کہ ٹوٹا بھی نہیں

کر تو لیں ترکِ تمنا کا ارادہ لیکن — قہر یہ ہے وہ فسوں گر ستم آرا بھی نہیں

بجلیاں کوندتی ہیں دل کے نہاں خانے میں — تیز رفتاریٔ ایام کا شکوا بھی نہیں

رنگ کیوں اُڑ گیا گلشن کے ہواداروں کا — گرم جھونکا کوئی اس راہ سے گزرا بھی نہیں

سرد ہے مرگِ صفت مصرِ جنوں کا بازار — خوابِ یوسف بھی نہیں خوابِ زلیخا بھی نہیں

جب تم نہیں تو زہر ہیں دنیا کی لذتیں — کسی بہار آگ لگا دو بہار میں

بدل کے بھیس غمِ دل کہاں کہاں نہ ملا
تلاش جس کی تھی وہ دردِ جاوداں نہ ملا

کھڑا ہوں کب سے سرِ رہگذارِ وقت ندیم!
میں جس کے ساتھ چلوں ایسا کارواں نہ ملا

خزاں گذر گئی لیکن گلوں کے رنگ ہیں زرد
بہار کو صلۂ خونِ کشتگاں نہ ملا

کہاں سے ذہن میں چھپ چھپ کے وہم آتے ہیں
کبھی یقیں کو سراغِ رہِ گماں نہ ملا

میں اہلِ فکر کی بستی کبھی روند آیا ہوں
کہیں کوئی غمِ ہستی کا رازداں نہ ملا

کچل کے یاد کی لاشیں گذر گیا غمِ دہر
میں ڈھونڈتا رہا زخموں کا بھی نشاں نہ ملا

اُتر کے دیکھ چکا رنگ کے جزیروں میں
ترے شباب کا وہ رنگِ ارغواں نہ ملا

ہزار رنگ میں غزلیں کہیں مگر اے دوست
تری نگاہ کا پیرایۂ بیاں نہ ملا

ہم نشیں نکہتِ برباد کا ماتم کب تک
پھول ہر روز تو کھلتے ہیں گلستانوں میں

نشاطِ نغمہ کبھی کیوں بن گیا فغاں جیسے
چبھی ہے سینۂ احساس میں سناں جیسے

خیال بنتے ہیں، مٹتے ہیں، پھر اُبھرتے ہیں
بپا ہے دل میں کوئی محشرِ نہاں جیسے

فسانے بن کے حقائق، فریب دیتے ہیں
یقیں کا بھی وہی انداز ہے گماں جیسے

ق

سنا رہا ہے کوئی اور سُن رہا ہوں میں
سنی ہوئی کوئی فرسودہ داستاں جیسے

سمجھ سکا نہ مگر حُسن کے محوِ حیرت ہوں
فریب خوردۂ رنگینیٔ بیاں جیسے

چمک رہے ہیں تری یاد کے مہ و خورشید
زمینِ قلب پہ اُترا ہو آسماں جیسے

وہ تیرا پیرہنِ سُرخ، وہ خرامِ جواں
سفینہ رنگ کے دریا میں ہو رواں جیسے

بجھائے صرصرِ غم نے چراغ یاد ایسے
ہے اب خیال کی دنیا دھواں دھواں جیسے

نہ سیلِ رنگ، نہ جوشِ نمو گلستاں میں
بہار خود ہو خزاں کی مزاج داں جیسے

جام و مینا مری نظروں سے چھپا دیتے ہیں
اور اسی پیاس میں جینے کی سزا دیتے ہیں

عصرِ حاضر کے مسیحاؤں کا انداز یہ ہے
دُور بیٹھے ہوئے دامن کی ہوا دیتے ہیں

اجنبیت کی کڑی دھوپ ہے اور شہر کے لوگ
جن میں سایہ نہیں وہ راہ بتا دیتے ہیں

خون بہتا ہے نہ ہنگامہ بپا ہوتا ہے
یوں مرے خواب سرِ دار چڑھا دیتے ہیں

چاک دامن کی نمائش ہے نہ چشمِ نم کی
یوں بھی دیوانے ترے دادِ وفا دیتے ہیں

جن کی تعبیر کے صحرا میں گزارے دن رات
آنکھ لگتی ہے تو وہ خواب جگا دیتے ہیں

زُلف بکھرائے تری یاد کی شام آئی ہے
جادۂ دل پہ ہم اک شمع جلا دیتے ہیں

رنگ جب پھولوں کے خیمے پہ برس جاتا ہے
ہم بھی بازارِ جراحت کا سجا دیتے ہیں

آساں راہِ فکر حریفوں نے ڈھونڈ لی
میرے جنوں کی منزلِ دشوار دیکھ کر

سوچا تھا اب کریں گے گل و یاسمن کی بات
لب سی لئے ہیں حالتِ گلزار دیکھ کر

بجھتے ہیں اور بھڑکتے ہیں شعلے حیات کے
روئے سحر پہ شام کے آثار دیکھ کر

ضبطِ الم کا آج بھرم اپنے کھل گیا
اہلِ ستم کو درد میں غم خوار دیکھ کر

موجِ خیال پھیلتی جاتی تھی تا فلک
رکنے لگی ہے وقت کی رفتار دیکھ کر

ناگفتہ رہ گئی ہے مری داستانِ شوق
تیری جبیں پہ شرم کے آثار دیکھ کر

آنسو ہیں یا ستارے ہیں کیا فیصلہ کریں
شہرِ طرب میں غم کی شبِ تار دیکھ کر

آنکھیں کھلیں تو دھوپ نے لے لی تھی وہ جگہ
سوئے تھے تیرا سایۂ دیوار دیکھ کر

فطرت نے سونپ دی مجھے دنیائے آرزو
شائستگیٔ غم کا سزاوار دیکھ کر

گیا تھا بزمِ محبت میں خالی جام لئے — کٹی ہے عمر گدائی کا اہتمام لئے

کہیں ہوئے نہ کبھی جو روشن محبتوں کے چراغ — ہوائیں دوڑ پڑیں وحشتوں کے دام لئے

طلسمِ راز نہ کھل جائے تنگ بینوں پر — تمہارے نام سے پہلے ہزار نام لئے

میں ڈھونڈتا ہوں کوئی تشنۂ طلب تو ملے — جہانِ فکر کی مینائے لالہ فام لئے

بھٹک رہا ہوں میں تنہائیوں کے جنگل میں — حیات رقص میں ہے حسنِ صبح و شام لئے

کبھی ملی تھی جو اک دردِ نارسا کی خلش — میں جی رہا ہوں وہی زخمِ ناتمام لئے

کسی کی یاد میں اکثر یہی ہوا محسوس — فلک زمیں پہ اترا مہِ تمام لئے

ملی ہے گردشِ ایام ہر زمانے میں — سحر امید کی اور جاں کنی کی شام لئے

گلشنِ دل میں ملے، عقل کے صحرا میں ملے ‏ ‏ ‏ جو کبھی ملنا ہے ملے اور اسی دنیا میں

برہمیِ انجمنِ شوق کی کیا پوچھتے ہو ‏ ‏ ‏ دوست. بچھڑے ہوئے اکثر صفِ اعدا میں

آنے والوں نے مرے بعد گواہی دی ہے ‏ ‏ ‏ کئی گلزار مرے نقشِ کفِ پا میں

یوں بھی گذری ہے کہ چھائے رہے بیداری پہ ‏ ‏ ‏ نیند آئی تو وہ غم خواب کی دنیا میں

نہیں معلوم کہ کیا دیکھنے آئے تھے ادھر ‏ ‏ ‏ بے اجر لوگ بہت شہرِ تماشا میں

پھر امیدوں نے یہیں گاڑ دیئے ہیں خیمے ‏ ‏ ‏ رنگ کچھ اڑتے ہوئے دامنِ صحرا میں

فاصلوں سے نہ مرے شوق کی منزل ناپو ‏ ‏ ‏ شش جہت صید مرے دامِ تمنا

نہ بزمِ دوست نہ صحنِ چمن نہ روئے نگار
فریبِ شوق میں اب تک گزر رہی ہے بہار

اُفق سے رنگ کئی پھوٹے کہ زمیں پہ گرے
ابھی اُڑا تھا مری چشمِ آرزو سے غبار

انہیں کو وقت نے سونپی ہے آج راہبری
کہ جن کے نقشِ قدم سے ہیں راستے بیزار

ہوئی یہ بات ترے التفات سے معلوم
جسے گناہ سمجھتے رہے تھے ہم گناہ نہ تھا

نہ دل کھلے ہوں تو کھلنا گلوں کا ہے بے سود — جہاں نہ غم ہو الٰہی وہیں بہار آئے

نہ پوچھ کیوں سرِ کوئے حبیب اے ہمدم — ہزار بار گئے ہم ہزار بار آئے

بُرا بھی کیا ہے گذر جائے گر یونہی اے دوست — شبِ خیال کٹے روزِ انتظار آئے

بھٹک رہا ہے مسافر خیال کا ہر سو — اشارہ کر دے تو منزل کا اعتبار آئے

تمہارا درد ہمیں جھیل لے گئے تنہا — نہ چارہ ساز ملے اور نہ غم گسار آئے

تری نگاہ سرِ بزم تھی فسوں پرداز — گئے جو یاس کے مارے امیدوار آئے

مجھے تو رسمِ محبت نہ راس آئی ندیم — خدا کرے یہ جنوں تجھ کو سازگار آئے

خیالِ دوست سے مہکا ہوا ہے دشتِ حیات — مجھے تو رنج ہو ایسے میں گر بہار آئے

○

تم نے بخشے تھے جو لمحاتِ محبت مجھ کو — اُن کی رگ رگ سے نچوڑی ہے لطافت میں نے
چند لمحاتِ محبت جو دئے تھے تم نے — اُس میں بھی ڈھونڈ نکالی تھی حلاوت میں نے
جتنے دن مجھ پہ مسرت کا فسوں طاری تھا — نہ سُنی گردشِ دوراں کی شکایت میں نے
جب تلک فرق پہ سایہ تری زلفوں کا رہا — کی شب و روز زمانے پہ حکومت میں نے
جاگتے سوتے میں راہوں میں گذرگاہوں پر — خوب لوٹی ترے دیدار کی دولت میں نے
کچھ مخل تھا نہ تری یاد میں ہوا ے ہمدم — فکرِ کونین سے لی اس لئے رخصت میں نے

○

فیضِ حق ہے کیا نظامِ گردشِ ایام ہے
ختم ہر شب پر سحر ہے ہر سحر کی شام ہے

پھول کھلتے ہیں چمن زاروں میں آتی ہے بہار
ہر کلی اک حور ہے تو ہر شجر گلفام ہے

پھر کسی دن سوکھ جاتے ہیں نہالانِ چمن
کیا بہارِ زندگی کا بس یہی انجام ہے

نت نئی صورت میں جلوہ ساز ہوتی ہے حیات
ایک جانب چنگ و نغمہ اک طرف کہرام ہے

کوئی مجبوری کا شاکی ہے تو کوئی شاد کام
مرغ اک آزاد ہے اور ایک زیرِ دام ہے

ایک مرتا ہے کہ کام آئے کسی رنجور کے
ایک کو بس اپنے ہی تسکینِ دل سے کام ہے

اک طرف یہ حکم رندوں سے بچاؤ میکدہ
میکشوں کے واسطے اک سُو صلائے عام ہے

ایک جانب دشت و در میں اڑ رہی ہے ریگِ گرم
ایک حصے میں زمیں کے سردیٔ آلام ہے

اب وہ چلے ہیں مجھ کو منانے دیکھ چکے بس خواب سہانے

پا کر آج مجھے کچھ تنہا کھول دئیے یادوں نے خزانے

جن کی دید سے مستی پیدا

دیکھے ہیں میں نے وہ میخانے

ہجر کا درد نہ وصل کی خواہش ایسے بھی اکثر گذرے زمانے

ہنس دئیے روتا دیکھ کے مجھکو نالے یوں بنتے ہیں ترانے

ناصح مشفق جان بھی چھوڑو

ہم دیوانے تم فرزانے

پوچھو ایک بھی ہونٹ تک آیا پھر ٹوٹے کتنے پیمانے

خود کو کوئی یوں بھی کھوتا ہے شام ہوئی گھر چل دیوانے

شوقِ فضول

منظومات

محبت کی بازگشت

فریبِ تصوّر

محسوساتِ قلب

یادگارِ فراق....

نالۂ دل

کیفیاتِ قلب

خواب میں آنے والی سے

قیدیٔ عالمِ خیال میں

احساسِ تنہائی

دولتِ نایافت سے

تعمیرِ حیات

یہ نظامِ کہنہ

بیماری کی خبر

شہرت

خوفِ شکست

تغیّر

تصور کے دھندلکے میں

میں نے بھی محبت کی ہے مگر۔

رندِ نصیحت مشرب سے

اعتراف

ایک یادگار رات

کل آج اور کل

وہ چند لمحے

روشنی لاؤں کہاں سے

عزمِ کوہکنی

دوبارہ کافی ہاؤس کھلنے پر

وادیٔ افسوں

محبّت کی بازگشت

بیمارِ محبت ترا پھر ہوش میں آیا!
کچھ دیر بھی دلگیر نے آرام نہ پایا!
تیری نگہِ شوخ نے پھر کھینچ بلایا
ناکامِ محبت تجھے پھر دیکھ رہا ہے!

اس وقت نہیں کچھ بھی پئے نذر میسّر
ہو جائے مگر رحم و کرم کی نظر اس پر
ٹوٹا ہوا اک شیشۂ دل ہاتھ میں لیکر
ناکامِ محبت تجھے پھر دیکھ رہا ہے!

ہنس کر جسے آباد کیا تھا وہی دل ہے
بھولے سے جسے شاد کیا تھا وہی دل ہے
خود ہی جسے برباد کیا تھا وہی دل ہے
ناکامِ محبت تجھے پھر دیکھ رہا ہے!

غم سے نہ ہوا سیر ابھی تک دلِ ناشاد
باقی ہے ابھی تجھ میں بہت طاقتِ بیداد
کر دے دلِ برباد کو کچھ اور بھی برباد
ناکامِ محبت تجھے پھر دیکھ رہا ہے!

پہلے کی طرح عشق کا مجبور بنا دے
مانگے جو دعا جینے کی مرنے کی سزا دے
جی بھر کے تجھے دیکھ لے بس اتنی رضا دے
ناکامِ محبت تجھے پھر دیکھ رہا ہے!

آئے جو کبھی ہوش تو دیوانہ سمجھنا!
قدموں سے سر اٹھ جائے تو اپنا نہ سمجھنا
اور ذوقِ محبت سے کبھی بیگانہ سمجھنا
ناکامِ محبت تجھے پھر دیکھ رہا ہے!

بے جان تمناؤں میں بھی روح پھونک دے
خوابیدہ ہے مٹنے کی تمنا کو جگا دے
اپنی نگہِ گرم سے اک آگ لگا دے
ناکامِ محبت تجھے پھر دیکھ رہا ہے!

انکارِ محبت کا وہ مایوس کُن انداز!
گویا ہے، پر جذبِ محبت کا ہے اعجاز
آئی ترے پروانے میں پھر قوتِ پرواز
ناکامِ محبت تجھے پھر دیکھ رہا ہے!

مایوس نہیں اب بھی ترے لطف و کرم سے
ہے جان ابھی ہاتھ اٹھانا نہ ستم سے
پھر عشق بلاتا ہے اسے سرحدِ غم سے
ناکامِ محبت تجھے پھر دیکھ رہا ہے!

سنہ ۱۹۳۳ء

فریبِ تصوّر

شب کی خلوت میں جب تم آتے ہو — دل کی دنیا میں مسکراتے ہو
مُسکرا کر مجھے رلاتے ہو — میری ہستی مٹاتے جاتے ہو
یاد کیوں اس قدر تم آتے ہو؟

زخمِ دل پھر ہے خونفشاں دیکھو! — اپنی بیداد کا نشاں دیکھو!
راز ہونے کو ہے عیاں دیکھو! — ہو تمہیں روبرو جہاں دیکھو
یاد کیوں اس قدر تم آتے ہو؟

کسی پہلو مجھے قرار نہیں — تم پہ کچھ مجھکو اختیار نہیں
اُف مرا بخت سازگار نہیں — اور تصوّر کا اعتبار نہیں
یاد کیوں اس قدر تم آتے ہو؟

پھر تمہیں یاد کر کے روتا ہوں اور منھ آنسوؤں سے دھوتا ہوں
درد بڑھتا ہے جب جو ہوتا ہوں وہم میں اپنی جان کھوتا ہوں

یاد کیوں اس قدر تم آتے ہو؟

دُور سی ہوگئی تھی کچھ منزل قوتِ ضبط پھر ہوئی زائل
نظر آیا اُمید کا ساحل پھر نہیں رُوح کو سکوں حاصل

یاد کیوں اس قدر تم آتے ہو؟

نہ ملے گی کبھی وفا کی داد ہل رہی ہے یقین کی بنیاد
تم کہاں اور کہاں تمہاری یاد بھولتا ہی نہیں دلِ ناشاد

یاد کیوں اس قدر تم آتے ہو؟

قید و بندِ حیات دھوکا ہے! نگہِ التفات دھوکا ہے!
حُسن کی کائنات دھوکا ہے! جبکہ ہر ایک بات دھوکا ہے!

یاد کیوں اس قدر تم آتے ہو؟

سنہ ۱۹۳۳ء

محسوساتِ قلب

مرے خالق انہیں موقع نہ ہو کوئی شکایت کا
سنا ہے لیں گے وہ آج امتحاں میری محبت کا

بدن میں جاں نہیں سینے میں لیکن آگ بھڑکی ہے
سمٹ کر نقطۂ دل بن گیا مرکز حرارت کا

بھلا وہ داورِ محشر سے کیونکر داد چاہے گا
ابھی سے کانپتا ہے دِل گنہ گارِ محبت کا

مری میت پڑی تھی وہ کھڑے آنسو بہاتے تھے
مُرقع تھا کوئی عبرت کا اور کوئی ندامت کا

اگر بڑھتی گئی یونہی جنونِ شوق کی شدت
الٹ دوں گا کسی دن بڑھ کے پردہ تیری خلوت کا

ہلاکِ جستجو اک دن انہیں میں مل گیا ہو گا
وہ بن جائیں گے آئینہ کسی دن میری صورت کا

بہک کر آج ساقی کے قدم چوما کیا پیہم
بڑا شہرا ہے میخانے میں اس اندازِ جرأت کا

اُتر آیا فلک سے مہرِ عالم تاب ذرّوں میں
اسی سے کچھ پتہ چلتا ہے ہر ذرے کی وسعت کا

میں کیا جانوں کہ محشر کیا ہے کس کو حشر کہتے ہیں
قیامت نام ہے لیکن تری رفتار و قامت کا

ترے نقشِ قدم ہیں جلوہ گر گورِ غریباں میں
نشاں یہ کچھ تو دیتے ہیں مری بربادِ تربت کا

۳۳ء

یادگارِ فراق...

(۱)

تیرے چھٹنے کا سماں اس وقت ہے پیشِ نظر

دیکھکر وہ خوفِ رسوائی سے ہر سو دیکھکر

میرا دامن تھام کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر —

دیکھنا اور مسکرا کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

مسکراتی جا رہی ہے چشم بھی نمناک ہے

اُف مری صبحِ مسرّت کا بھی دامن چاک ہے

التجا کی یہ ادا بھی کس قدر سفّاک ہے —

اشک بھر کے سر جھکا کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

ایک آویزش سی تھی اقرار اور انکار میں

محو تھا کچھ دیر تک تو میں انہیں افکار میں

ناگہاں تیری صدا گونجی در و دیوار میں —

چھا گیا ہستی پہ میری تیرا وہ کہنا "نہ جا"

وہ کشاکش میں مرا گھبرا کے رو دینا کبھی
اپنی ہستی کو ترے جلووں میں کھو دینا کبھی
باتوں باتوں میں ترا نشتر چبھو دینا کبھی ـــ
سر مرے شانے پہ رکھ کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

میری کشتیٔ عزائم آ گئی گرداب میں
لہر اٹھی تیری محبت کی دلِ بیتاب میں
تھا عجب ہنگامہ کُن یہ زندگی کے باب میں ـــ
روٹھنا اور منھ پھرا کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

(۳)

میری کچھ مجبوریاں رکنے سے مانع ہو گئیں
جاگ کر ساری تمنّائیں یکایک سو گئیں
عالمِ اسباب کی تاریکیوں میں کھو گئیں ـــ
سُن کے بھی میں کچھ نہ بولا تیرا وہ کہنا "نہ جا"

شوقِ دنیا نے ترے پہلو سے بہکایا مجھے
سبز باغ اک دولت و ثروت کا دکھلایا مجھے
تیرے دردِ عشق کو ادبار بتلایا مجھے ـــ
کچھ اثر آخر نہ لایا تیرا وہ کہنا "نہ جا"

اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا خونِ دل کرتا ہوا
تجھکو مضطر چھوڑ کر میں ناسزا رخصت ہوا
آج تک کانوں میں ہے لیکن وہی تیری صدا ۔
دور جانے پر بھی مڑ کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

تجھکو ہے اتنی محبت میں اسے سمجھا نہ تھا
اب سے پہلے میرا جذبِ آرزو سچّا نہ تھا
دیکھتا ہوں وہ کہ جو پہلے کبھی دیکھا نہ تھا ۔
وہ محبت کی نظر اور تیرا وہ کہنا "نہ جا"

تیرا اظہارِ تمنّا وقتِ رخصت بار بار
ہے مرے عہدِ محبت کی وہ زرّیں یادگار
جس پہ کرتا ہوں سوا تیرے میں ہر اک شے نثار ۔
یاد آتا ہے کبھی جب تیرا وہ کہنا "نہ جا"

سنہ ۱۹۳۴ء

نالۂ دل

کاٹی ہے انتظار میں مشکل سے شامِ غم
اب آئیے حضور کہ تاخیر ہو چکی

تکمیل ہو رہی ہے مرے جذبِ عشق کی
ہر شے میں منعکس تری تصویر ہو چکی

جاں دینے پر بھی آپ نہ آئے ہزار حیف
جو اختیار میں تھی وہ تدبیر ہو چکی

ہر آرزو فریب تھی جد و جہد کے بعد
خوابِ حیات کی مرے تعبیر ہو چکی

پوچھا کسی نے غیر سے حالِ مریضِ غم
ہونی تھی جتنی آہ میں تاثیر ہو چکی

سنہ ۱۹۳۴ء

کیفیاتِ قلب

یوں تو کہنے کو فقط وہ اک جھلک دکھلا گئے
کس طرح حیراں ہوں پھر ہستی پہ میری چھا گئے

ایک دردِ لذت آگیں ایک دلکش سی خلش
یہ محبت کی سزا ہو یا جزا ہم پا گئے

کون مستِ نازِ عزمِ میکشی کرتا ہے آج
خود ہی پیمانوں سے اُٹھ اُٹھ کر سبو ٹکرا گئے

میری حالت غیر تھی جانے کی جلدی تھی انہیں
یا تسلی کیلئے آئے تھے یا تڑپا گئے

مر مٹے لیکن نہ یہ سمجھا کوئی کس بات پر
موت ہی ہے عشق جاتے جاتے ہم بتلا گئے

مسکرا کر میری جانب سے نگاہیں پھیر لیں
اک اشارے میں وہ رازِ زندگی سمجھا گئے

بھول جاؤں وہ گھڑی میرے لئے دشوار ہے
جب کہ میرے غم کدے میں وہ اچانک آ گئے

اک زمانہ مست و بیخود ہے زہے عہدِ شباب
جس طرف گذرے اُدھر رنگینیاں برسا گئے

سامنے جب تک رہے وہ میں انھیں دیکھا کیا
میرے فرطِ اشتیاقِ دید پہ شرما گئے

آپ نے محوِ تصور کو دئے کیا کیا فریب
تھے گریزاں یا ابھی میری نظر میں آ گئے

سنہ ۳۴ء

خواب میں آنے والی سے

چھاؤں تھی تاروں کی، میں تھا اور تمہاری یاد تھی
ہر طرح کی کوششِ صبر و سکوں برباد تھی

ذہن میں کوئی تصوّر اور آتا ہی نہ تھا
دوسری جانب خیال اس وقت جاتا ہی نہ تھا
دور تک پھیلی ہوئی تخئیل کی زنجیر تھی
دل کے آئینے میں دھندھلی سی تری تصویر تھی
اور دل کہتا تھا یہ بھی ایک دن مٹ جائیگی
کچھ دنوں تک اور اسی صورت سے گردوری رہی
گو یقیں تھا ہے ترا عہد محبت استوار
لب تک آجاتے تھے لیکن پھر بھی شکوے بار بار

تھا تقاضا دل کا مل جاؤ تو تڑپائیں تمہیں
تم نے جو حالت بنائی ہے وہ دکھلائیں تمہیں

ناگہاں ٹھنڈی ہوا کی زلف لہرانے لگی
رات کی ساکن فضا میں مجھ کو نیند آنے لگی
جس کو چین آتا نہ تھا دم بھر میں غافل ہو گیا
محوِ غم آغوشِ فطرت میں پہونچکر سو گیا
روح تک احساسِ الفت سے مری سرشار تھی
سو رہا تھا میں مگر قسمت مری بیدار تھی
خواب کے ظلمات میں پہونچا مجھے آبِ حیات
یہ مرا جذبِ محبت تھا کہ تیرا التفات
آج بیداری بھی میری نیند سے شرما گئی
تو جھجکتی مسکراتی غم کدے میں آ گئی
پھر تو ظلمت خانۂ دل سے تجلّی ہو گئی
مدتوں کے تشنۂ غم کو تسلّی ہو گئی...
تھا تبسّم یا مداوا تھا وہ دل کے درد کا
جیسے گرمی میں کوئی جھونکا ہوائے سرد کا

چھپ کے مجھ سے مل رہی ہو اس قرینے کے نثار
خواب میں آنے کے اور تسکین دینے کے نثار
قالبِ تصویر میں تیرے قرب کا یہ پاس تھا

تھی کچھ ایسی بے خودی جس کا مجھے احساس تھا
لب تک آ کر سارے شکوے دل کے زائل ہو گئے
تیرے بازو میری گردن میں حمائل ہو گئے
ایک بوسے میں ترے مجھکو حیاتِ نو ملی
یوں شگفتہ ہو گیا دل جیسے کھلتی ہے کلی
بڑھ گئی تیری نظر میں روشنی میرے لئے
تیری آغوشِ محبت وا ہوئی میرے لئے
مل گئے چھوٹے ہوئے دو تشنہ کامانِ وفا
عشق کی تاریک دنیا میں اُجالا ہو گیا

عالمِ الفت میں ایسی زندگی نایاب ہے
دل یہ کہتا تھا کہ بیداری سے بہتر خواب ہے
کاش رہ جاتا اسی صورت نہ آتا ہوش میں
اور دہیں سے جا پہونچتا موت کی آغوش میں

قیدی عالمِ خیال میں

جس کو دیکھو اس فضائے مست میں دیوانہ تھا
ایک میں قیدِ ستم میں لطف سے بیگانہ تھا

وہ، کہ جس سے کانپتی تھی روحِ استبداد کی
جس پہ مدت سے نگاہِ غیض تھی صیاد کی
جرمِ حُبِّ وطن سے سر بسر مدہوش تھا
جس کا سر ننگِ غلامی سے وبالِ دوش تھا
جس کے دل میں حسرتِ تعمیرِ ملک و قوم تھی
ظالموں کی بھول کر بھی جس نے پابوسی نہ کی
قصرِ ظلم و جور جس کے سامنے تھا سر نگوں
خون رلواتا تھا جس کو قوم کا حالِ زبوں

آہ اُسی کے دست و پا میں آہنی زنجیر تھی
ملک کی اُلفت کا دم بھرنے کی یہ تعزیر تھی

قیدِ تنہائی ملی تھی ساتھیوں سے چھوٹ کر
جیسے گر جائے ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
کام رکنے کا الم تھا قید کا کچھ غم نہ تھا
رنج بیکاری کا تھا زنجیر کا ماتم نہ تھا

ناگہاں ہنگامہ برپا کن صدا آنے لگی
برق بن کر قلبِ افسردہ کو گرمانے لگی
پشت سے زنداں کی گذرا کاروانِ انقلاب
فاقہ کش چہروں پہ ان کے ہمت و جرأت نثار
ان کے ملبوسِ کہن پر دولت و ثروت نثار
عزم ان کی صورتوں میں فتح و نصرت ساتھ ساتھ
انقلاب ان کی جلو میں تھا بغاوت ساتھ ساتھ
اُن کے ہاتھوں میں نشانِ قوم لہراتا ہوا
ان میں سے ہر ایک اپنی دُھن میں کچھ گاتا ہوا
توڑ کر زنداں کا در آئی ہوائے انقلاب
صور کی آواز تھی وہ یا صدائے انقلاب
گونج سے آواز کی ہلنے لگے دیوار و در

میں نے یہ دیکھا کہ ہر ذرّہ پہ ہوتا ہے اثر
روحِ آزادی تڑپ اٹھی رگ و شریان میں

عالمِ تخئیل میں طوفاں سا برپا ہوگیا
قید سے پہلے کی دنیا میں پہونچکر کھوگیا

یعنی اِس برباد حالت میں بھی میں دل شاد تھا
جسم زنجیروں میں تھا لیکن خیال آزاد تھا

یک بیک زنجیروں کا بارِ گراں گھٹنے لگا
کوئی پردہ سامنے سے آنکھ کے ہٹنے لگا

طائرِ تخئیل مجھ کو ساتھ لے کر اڑ گیا
اور ہوا محسوس میں زنداں کے باہر آگیا

باہر آکر پھر اسی مقصد پہ عامل ہوگیا
جس کو ناقص چھوڑ کر میں قیدیٔ زنداں بنا

ہوگئی ہر سانس پھر وقفِ حصولِ آرزو
پھر ہوئی مجھکو عروسِ مُدعا کی جستجو

لو موافق ہوگئی تقدیر بھی تدبیر بھی
خوابِ آزادی کی پوری ہوگئی تعبیر بھی

مٹ گئے یکسر غلامی کے سب آئینِ کہن
مل گئے ہی دستِ قوی سے نکلا ارمانِ وطن
دل میں ایسا جوش جیسے آگ سے شعلہ اٹھے
وہ مسرت تھی کہ میرے دست و پا تھرّا اٹھے
ناگہاں زنجیر کی جھنکار نے چونکا دیا
قید سے باہر نہیں ہوں یہ مجھے بتلا دیا
ہائے جب تک عالمِ تخئیل یوں آباد تھا
اتنے لمحوں کے لئے میرا وطن آزاد تھا

سنہ ۳۷ء

○

احساسِ تنہائی

چاندنی ہے، ہوا میں خنکی ہے — درد رہ رہ کے چھیڑتا ہے مجھے
دہر نے شکلِ غم بنائی ہے — گرد سی اک فلک پہ چھائی ہے
وہی تارے ہیں چرخ پر باقی — چاند کی ضو جنھیں مٹا نہ سکی
ہاں مگر کم ہے اُن کی اس طرح آب — جیسے شبنم کے نیچے رنگِ گلاب
گم ہیں حیران و بدحواس ہیں سب — میرے دل کی طرح اُداس ہیں سب
چاند پہ ہے یہ ابر ہلکا سا — یا اُمیدوں پہ یاس کا سایہ

جب فلک یہ سماں دکھاتا ہے — کیوں تمہارا خیال آتا ہے
شمع سی تم نے جو جلائی تھی — آگ سینے میں جو لگائی تھی
تم نے شاید خبر نہ پائی ہو — بادِ فرقت بجھا چکی اس کو
زندگی میں نہ غم نہ راحت ہے — کیسی کھوئی ہوئی سی حالت ہے
اب تصوّر میں بھی ہے تنہائی — ترکِ اُلفت کی یہ سزا پائی
خوف ہے دل کا خوں نہ ہو جائے — کہیں مجھ کو جنوں نہ ہو جائے

سنہ ۱۹۳۷

دولتِ نایافت سے

(ایک خط کے جواب میں)

پھر آج ہے جو سزا نامہ و پیام تجھے
حریمِ حسن کے ساکن مرا سلام تجھے
اب عہدِ عشق کی ناکامیوں کا ذکر نہ کر
شکستِ عہدِ محبت پہ آہِ سرد نہ بھر
نہ یاد کر وہ زمانہ کہ جب خیال مرا
تجھے بھی میری طرح سوگوار رکھتا تھا
تری خوشی میں مرے غم کو تھا نوید سکوں
ترا اُداس تبسم مجھے پیامِ جنوں

قسم ہے تیری محبت بھری نگاہوں کی
کبھی جو میرے لئے تھیں قسم اُن آہوں کی

قسمِ ہلال کے ہم شکل سُرخ ہونٹوں کی
جنھیں تراش کے فطرت بھی مسکرا اٹھی
میں جانتا ہوں وفا ہے وہ آتشِ پنہاں
کہ جس کی آنچ میں وہ زرخ کی آگ بھی ہوتی ہاں
مجھے خبر ہے کہ اُلفت کی شعلہ بار ہوا
بھڑک کے کرتی ہے بجھنے میں پیش و پس کتنا
مگر بھلا دے مجھے ناشناسِ غم بن کر
کہ اس طرح کہیں ہوتی ہے ساری عمر بسر
کیا ہے جس کے مقدّر نے اب اسیر تجھے
اسی کو مرکزِ اُمید و آرزو کر لے
ترا خیال مصیبت سے روشناس نہ ہو
خدا کرے مرے غم میں کبھی اُداس نہ ہو
نشاطِ حُسن کو آزردگی سے کیا مطلب
بھری بہار کو افسردگی سے کیا مطلب
وفا کی باغ کے اے سروِ بے نیازِ خزاں
خُدائے عشق کے ہاتھوں کی بے پناہ کماں

بھلا سکوں گا تو میں بھی تجھے بھلاؤں گا
کہ اب خیالِ محبت نہ دل میں لاؤں گا

فریبِ وقت کا ہم پر بھی چل گیا افسوس
مری دمن وہ زمانہ بدل گیا افسوس
نظامِ کہنہ نے مجبور کر دیا ہم کو
قریب لا کے بہت دور کر دیا ہم کو
رہا نہ عشق کہ تھی نازشِ دوام مجھے
جنوں میں پھر وہ مرے کیوں ہوں اور کام جیسے

گماں نہ کہہ نہیں تیرے لئے ملال مجھے
مگر سکون سا دیتا ہے یہ خیال مجھے
تمام دورِ غلامی کے جب ستم ہوں گے
ہماری طرح کے ناکامِ عشق کم ہوں گے

۳۹ سنہء

تعمیرِ حیات

بنا کے اپنی ادا کا شہید اے ساقی
یہ بے رُخی ہے کرم سے بعید اے ساقی

سمجھ میں آنے لگا ہے تری نگاہ کا راز
بڑھے گا اور ابھی ذوقِ دید اے ساقی

نگاہِ گرم کے آنسو دکھے دلوں کی پکار
یہ جنسِ بیش بہا ابھی خرید اے ساقی

وفا کا رنگ بدل دے جفا کی شکل بدل
بدل کے طرز کر عہدِ جدید اے ساقی

ستم اٹھا کے جو اب تک جیا کئے ہم لوگ
لگی ہوئی ہے کہیں تو امید اے ساقی

لہو حیات بنانے میں کام آ جائے
اسی پہ مرتے ہیں تیرے شہید اے ساقی

تڑپ کے یاد جسے کر رہے تھے دیوانے
اب آ گیا وہی وقتِ سعید اے ساقی

وہ سُرخ افق پہ چمکتا ہے ماہ کا خنجر
ہوئی ہے اب ترے مستوں کی عید اے ساقی

وہ دیکھ مست ترے بڑھ رہے ہیں لیکے نشاں
کوئی پیام بہ طرزِ جدید اے ساقی

ہر اک سے کہہ دے کہ نیچے نشاں کے آ جائے
سنا دے نعرۂ ہل من مزید اے ساقی

نہ فکر موت کی کر یہ جہاں بدل دیں گے
لہو میں ڈوب کے تیرے شہید اے ساقی

ہمارے قبضے میں اب ہوگی کائناتِ عمل — وہ قفلِ غیب کی ٹوٹی کلید اے ساقی
شبِ سیاہ کی تاریک و سرد منزل سے — ہوئی ہے صبحِ درخشاں پہ دید اے ساقی

بھٹک رہے تھے مگر راہ پا گئے ہم لوگ — ترے کرم سے اُجالے میں آ گئے ہم لوگ
مذاقِ دہر بدل کر سما گئے دل میں — بدل کے راہ زمانے پہ چھا گئے ہم لوگ
نظر ملانے کی دہقاں میں آ گئی قوت — خودی کا راز اُسے بھی بتا گئے ہم لوگ
جسے دبا نہ سکیں قوتیں زمانے کی — کچھ ایسے زور کا طوفاں اُٹھا گئے ہم لوگ
کھنڈر میں ہیں مگر امن و خوشی کا سایہ ہے — جفا و ظلم کے ایواں گرا گئے ہم لوگ
ابھی اُجاڑ ہے لیکن سنوار لیں گے جب — کہے گی خلق کہ دنیا بنا گئے ہم لوگ

بدل رہے ہیں نظامِ کہن کی بنیادیں — کہیں ہنسی کی صدا ہے کہیں یہ فریادیں
بنے گا دہر یہ فردوس جس طرح بھی بنے — کریں گے ختم فریب و ستم کی میعادیں

ریا پرستوں سے ایمان و دیں چھنیں گے — کسی سے زر تو کسی سے زمیں چھنیں گے
قدم پہ فاقہ کشوں کے گرا کے تاج اک دن — غریب رہنے کا دل سے یقیں چھنیں گے

جہاں خیال ہے آزاد جسم و جاں آزاد
لگی ہے ایسے جہاں کی امید اے ساقی

یہ نظامِ کہنہ

ہم نشیں کھٹکی تو ہو گی تجھکو بھی یہ ایک بات
کب سے گھیرے ہے نظامِ کہنہ کی تاریک رات

اس شبِ تاریک کی آغوش میں ہے وہ جہاں
جس جگہ اُڑتی ہیں عدل و حریّت کی دھجّیاں

روپیہ سے رات دن چلتا ہے جس کا کاروبار
سیم و زر سے جس جگہ ہوتے ہیں رشتے استوار

دام لگتے ہیں زبانی جس جگہ اعمال کے
جس جگہ چلتے ہیں سکّے تک ضعیف اقوال کے

جس جگہ مفلس کھڑتے ہیں کارواں در کارواں
حکمراں ہیں جس جگہ زردار کی عیّاریاں

جس جگہ انسانیت کا حال ہے زار و زبوں
چوستا ہے جس جگہ انسان خود انساں کا خون

جس جگہ قانون کے ڈر سے زباں ہلتی نہیں
جس جگہ بیمارِ مفلس کو دوا ملتی نہیں

جس جگہ بیکار امیروں کی چمکتی ہے جبیں
جس جگہ محنت کا پھل مزدور کو ملتا نہیں

جس جگہ آگے نکلتا ہے دلیلِ گمرہی
جس جگہ تاریخ دہراتی ہے افسانہ وہی

فطرتِ انسان جس جا رنگینی باقی نہیں
جس جگہ علم و ادب میں تازگی آتی نہیں

نوجوانوں کو جہاں ملتی نہیں بڑھنے کی راہ
جس جگہ ترکِ مراسم کو سمجھتے ہیں گناہ

جس جگہ ہر لمحہ پابندی ہے اہلِ ہوش پر
میّتِ تہذیب ہے خود غرضیوں کے دوش پر

ہے جہاں گیری جہاں جمہوریت کے بھیس میں
جنگ اپنے واسطے ہے دوسروں کے دیس میں

آگیا وہ وقت خود ہے اپنی ہستی سے خجل
یہ نظامِ کہنہ بنیادیں ہیں جس کی مضمحل

اس کی بنیادوں پہ تیشہ مارنے کی دیر ہے
نوجواں تیار ہیں للکارنے کی دیر ہے

ملک پر غیروں کا ڈیرا ختم ہوتا ہی نہیں
کیا قیامت ہے اندھیرا ختم ہوتا ہی نہیں

طاقتِ پرواز ہے اور آشیاں پر قید ہے
حوصلے بیدار ہیں لیکن زباں پر قید ہے

وقت کی آواز ہے ہم کو ابھرنا چاہئے
اس تضادِ زندگی کو ختم کرنا چاہئے

جس نے روکا ہے ترقی سے یہی زنجیر ہے
اس نظامِ کہنہ کی تخریب بھی تعمیر ہے

سنہ ۳۹ء

بیماری کی خبر

جب خط میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا
میں بیٹھ کے تنہائی میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں
کچھ اندھے، کوڑھی، دیوانے آنکھوں میں سمانے لگتے ہیں
کچھ قحط زدہ بھوکے پیاسے جاں دے دے کر خاموشی سے
دنیا میں مفلس رہنے کی تعزیریں پانے لگتے ہیں
کٹتے ہیں جن کے شام و سحر اک قابلِ نفرت خواری سے
جو مرتے ہیں آسانی سے اور جیتے ہیں دشواری سے
خوں چوس لیا ہے غیروں نے بیمار بھی ہیں نادار بھی ہیں
جینے کی تمنا ہے دل میں اور جینے سے بیزار بھی ہیں

اس درد کی ماری دنیا میں ایسے انساں کیوں بستے ہیں
جو ساری عمر ضرورت کی چیزوں کیلئے بھی ترستے ہیں

گو ایسے لوگ بھی ہیں جنکو آسائش ہی آسائش ہے

وہ سب ہے مہیا ان کے لیئے جس چیز کی انکو خواہش ہے

جن کے لیئے سونا مٹی ہے جن کے لیئے موتی سستے ہیں۔

لیکن مجبور انسانوں کو حق کیوں نہیں حاصل جینے کا

طوفان ہی کے قبضے میں کیوں پتوار ہے ان کے سفینے کا

کب تک بے بس انسان یونہی تقدیر کا رونا روئے گا

کب تک بے کچھ پائے ہوئے اپنا ہی سب کچھ کھوئے گا

کب تک اندھی بھیڑوں کی طرح یہ اپنی راہ نہ پائے گا

کب تک موت کے آگے سے پیچھے ہی ہٹتا جائے گا

پھر خود ہی دل بول اٹھتا ہے اب وقت بدلنے والا ہے

ذرے سورج بن جائینگے وہ دور کبھی آنیوالا ہے

امید کی ایک ننھی سی کرن مایوسی پر چھا جاتی ہے

اور اسکی ضو میں ایک نئی دنیا بازو پھیلاتی ہے

سوئی سی رگوں میں چبھتی ہے آنکھوں میں آنسو آتے ہیں

دل بے قابو ہو جاتا ہے جینے کی ہوس بڑھ جاتی ہے

جاں وقف پیش ہو جاتی ہے اور عزم بغاوت کرتی ہے

اُس وقت اک سیل ارادوں کی سینے سے ہو کے گزرتی ہے
دنیا کو خلد بنانے کا جو دھیان سا دل میں آتا ہے
ایسی خبروں کے سُننے سے وہ اور قوی ہو جاتا ہے
جب خط میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا
میں بیٹھ کے تنہائی میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں

ہم جنگ کریں گے فطرت سے فطرت پر قابو پائیں گے
اور فطرت پر قابو پا کر اک روز امر بن جائیں گے

سنہ ۴۰ء

شہرت

یہ ہلکے پر لگا کر کون اڑتا ہے ہواؤں میں
یہ کس کا نقش روشن ہو گیا دھندلی فضاؤں میں

سفر بڑھتا ہے جتنا قوتِ پرواز بڑھتی ہے
یہ ندی وقت کے دھارے پہ آکر اور چڑھتی ہے

یہ بے پروا ہے گو لوگ اس کو خاطر میں نہیں لاتے
حسد کے تیر چلتے ہیں مگر اس کو نہیں پاتے

خرد کی راہ میں شمعیں جلا کر بڑھتی آئی ہے
ہمی کی دھوپ ہے جو بے محابا چڑھتی آئی ہے

چٹانوں کے کلیجے پر قدم اس کا پڑا ہو گا
خیالوں کی بلندی پہ علم اس کا گڑا ہو گا

جہالت کے اندھیرے سے گذرنا ہی پڑا ہو گا
تغافل کا بیابان پار کرنا ہی پڑا ہو گا

دیا ہوگا کہیں تنقیدِ جائز کو خراج اس نے
کہیں تعریف کے پھولوں کا پہنا ہوگا تاج اس نے

اسے تدبیر کے رنگین شعلوں نے ہوا دی ہے
اسے تقدیر نے گھبرا کے بڑھنے کی رضا دی ہے

کبھی ایثار کی منزل کبھی میدانِ جنگ آیا
بڑی قربانیوں کے بعد آنکھوں میں یہ رنگ آیا

رواں ہے اس کی موجِ ناز بحر و بر کے سینے پر
مشقّت کا پھریرا نصب ہے اس کے سفینے پر

کبھی پُرشور طوفانوں کے ہیبت زا تلاطم میں
کبھی مثلِ نظر رقصاں دیارِ ماہ و انجم میں

مشقّت ہی کے زانو پر اسے آیا تو خواب آیا
کشاکش میں حیات و موت کی اس کا شباب آیا

فشارِ ناتمامی میں گھُٹا جاتا تھا دم اس کا
مگر ہوتا نہ تھا زورِ ترقی پھر کبھی کم اس کا

کسی فنکار کی یا ماہرِ حکمت کی کاوش ہے
کسی کی زندۂ جاوید بن جانے کی خواہش ہے

تھا محبت میں وہ بھی دور کبھی
رات دن چاندنی برستی تھی
گرچہ ہر لمحہ وقفِ عشرت تھا
زندگی وقت کو ترستی تھی

راہِ الفت کی سخت منزل میں
ہر قدم استوار تھا اپنا
خوب پیتے تھے مے اُن آنکھوں سے
نشہ پہ اختیار تھا اپنا

اِس کے بعد

اب لرزتے ہیں ہر قدم پہ پاؤں
اب محبت سبک خرام نہیں
جن سے پی کر قرار آتا تھا
حیف ان آنکھوں میں اب وہ جام نہیں

ٹوٹ جاتی ہو بار بار جو ڈور
اس میں گرہیں لگائیں گے کب تک
عقل جب روشنی دکھاتی ہو
دل کے دھوکے میں آئیں گے کب تک

دل تو دھوکے میں رہ بھی سکتا ہے
عقل کب تک فریب کھائے گی
یونہی گر ٹوٹتی رہی تو یہ ڈور
آخری بار ٹوٹ جائے گی

سنہ ۴۲ء

تصوّر کے دھندلکے میں

شام کی راہ پہ جلنے لگے تاروں کے چراغ
اب بھی دھندلے ہیں مگر میرے تصوّر کے نقوش
جیسے پائے نہ کوئی راہِ محبت کا سُراغ
سُرخ تحریر پہ جس طرح سے پانی پڑ جائے
نقش جمتا بھی نہیں، شکل بدلتی بھی نہیں
ڈوبتی بھی نہیں یہ ناؤ، سنبھلتی بھی نہیں

سُرمئی ابر کے ٹکڑے پہ طلائی تحریر
میز پہ جیسے کسی دوست کی دھندلی تصویر
اور وہ دوست جسے غم نے بھلا رکھا ہے
(صرف تخیّل ہے تخیّل میں کیا رکھا ہے)

چھو گئے ہاتھ سے میرے ابھی اس شوخ کے ہاتھ
جسم بیدار ہوا جاتا ہے آنکھیں رنگیں

... ...

(صرف اک وہم ہے اے شوق نہیں، کوئی نہیں!)

اور یہ کون چلا آتا ہے کمزور و نزار
اس کو تو چھوڑ کے زنداں میں ابھی آیا تھا
اس کا پیغام بھی سلمیٰ کے لئے لایا تھا
اب تو سلمیٰ نہیں پہونچاؤں وہ پیغام کسے
(چھوڑ سکتی ہے بھلا گردشِ ایّام کسے!)

گھر میں روتے ہوئے بچوں کی صداؤں کا گداز
دور پہ بھونکتے کتّوں کی پریشاں آواز
ہر صدا ذہن میں دھنستی ہی چلی جاتی ہے
نیم روشن کسی گوشے میں جگہ پاتی ہے

اور باتیں بھی چلی آتی ہیں سبب عذرِ سوال
یہی جینے کی تمنا یہی مرنے کا خیال
اُن کے وعدے کی خوشی اُن کے نہ آنے کا ملال

کتنے غمناک و طربناک خیال آتے ہیں
اور پھر وقت کی آغوش میں سو جاتے ہیں
(ہو گی فرصت تو کسی رات کی تاریکی میں
انھیں چھیڑوں گا کہ یہ روح کو گرماتے ہیں)

وہ بگل جنگ کے بجنے لگے اب جاتا ہوں
خود کو اک اور ہی جادے پہ رواں پاتا ہوں
پھر ہے میدانِ عمل سامنے مسرور ہوں میں
اب خیالات کی دنیا سے بہت دور ہوں میں

سنہ ۴۲ء

میں نے بھی محبت کی ہے مگر

میں نے بھی محبت کی ہے مگر اس وقت نہ اس کا ذکر کرو
وہ تنہا میرا غم ہے اسے تنہا مجھ کو ہی اٹھانے دو

جس درد سے ہم سب مضطر ہیں آؤ کچھ اس کا ذکر کریں
سر جوڑ کے بیٹھیں کچھ سوچیں اس سے بچنے کی فکر کریں
یہ کیسی بھیانک تاریکی ہر سمت سے گھیرے لیتی ہے
یہ کیسی ہوا ہے جہازوں کو جو درسِ تباہی دیتی ہے
تاریک دھوئیں کی بارش سے دم گھٹتا ہے انسانوں کا
جائیں بھی کدھر ہر رستے پہ پہرہ ہے یہاں طوفانوں کا
شہروں کی خموش آبادی میں کیوں ہلچل ہے بیزاری ہے
کیوں رنگ اڑے ہیں چہروں کے کیوں وحشت سب پر طاری ہے
یہ کیسے درندے رقص کناں ہیں ہول سا چھایا جاتا ہے
یہ کون بہیمیت کے سُروں میں بھیانک گانے گاتا ہے

یہ کیسے خون کے دھبے ہیں جو ناچ رہے ہیں فضاؤں میں
یہ کیسے خونی باجوں کی آواز بسی ہے ہواؤں میں
یہ کیسی درد کی ٹیسیں ہیں جو ہر دل کو تڑپاتی ہیں
بارود کی بُو میں اُلجھی ہوئی کیوں گرم ہوائیں آتی ہیں
بچوں پہ یتیمی آتی ہے ماؤں پہ رنڈاپا آتا ہے
کیوں بادِ سحر کا ہر جھونکا پیغامِ جدائی لاتا ہے

یہ سب کچھ دیکھ کے اپنا غم بھی شاید ذہن میں آئے گا
ہونٹوں سے آہیں نکلیں گی دم سینے میں گھبرائے گا
کمرے کی کتھی جنوں کی جو بجلی پھر سر پہ کڑک ہی جائے گی
جو دل میں دبا کر رکھی تھی وہ آگ بھڑک ہی جائے گی
جو باہم گذری ہیں راتیں وہ راتیں یاد آئیں گی سب مجھے
جو اب تک لذت دیتی ہیں وہ باتیں یاد آئیں گی سب مجھے
جن میں غم کھو جاتا تھا کبھی وہ سپنے مجھ پر چھائینگے
جو وصل کی رات میں برسے تھے ساون کے وہ بادل آئینگے
بکھری ہوئی تانیں نغموں کی کانوں میں مرے بھر جائینگی
سر بندھن توڑ کے پھر مجھ کو اس دنیا میں پہونچائیں گی

میں تھوڑی دیر تڑپ لوں گا غم سہہ لوں گا خون رو لونگا

اک بوجھ سا دل پر ہوگا مرے کچھ دیر نہ ہنس کر بولوں گا

لیکن جب اور بڑے دکھ میں دنیا کو کھویا پاؤں گا

لیکن اپنے غم کے اندھیرے سے فوراً باہر آجاؤں گا

یوں دیکھ کے نوعِ انساں کو پستی کی اندھیری منزل میں

طوفان بداماں اٹھے گی اک موجِ جنوں میرے دل میں

یہ درد سے پگھلا دل میرا ہر سانچے میں ڈھل جائے گا

جو صرف اپنے کام آتا ہے اوروں کے بھی کام آئے گا

احساس عمل میں بدلے گا جلد ایسا وقت بھی آئے گا

یہ آتشِ غم بجھ جائے گی یہ دورِ ستم مٹ جائیگا

جب امن و اماں کے دن ہوں گے جب عیش و مسرت کی راتیں

اُس وقت سناؤں گا اکثر میں عشق و محبت کی باتیں

سنہ ۴۳ء

رند نصیحت مشرب سے!

(مسمّٰی بہ جوشؔ ملیح آبادی)

مت بار بار پوچھ میں کیوں سوگوار ہوں
ہوتا ہے مجھکو شک تری صحبت پہ بار ہوں

اے دوست لطفِ بزم میں کھو جاؤں کس طرح
آتی نہیں ہے نیند تو سو جاؤں کس طرح

ہاں سچ ہے مجھ پہ فکر کے بادل سے چھائے ہیں
خود میں نے اپنے گرد یہ حلقے بنائے ہیں

اب تجھ سے کیا بتاؤں ہے کس موڑ پہ نظر
کہرے کی دھند میں مجھے درپیش ہے سفر

جب سے سمجھ میں آتے ہیں دنیا کے بیش و کم
لرزاں ہے شمعِ عیش سرِ رہگذارِ غم

آنکھیں کھلی ہیں بند انھیں کیسے میں کروں
غم کی اندھیری رات کو دن کس طرح کہوں

جب ہر قدم پہ ٹھوکریں کھاتی پھرے حیات

جام و سبو میں غرق کروں کیسے کائنات

کانٹے بچھے ہیں راہِ محبت میں دور تک

غم کے اثر سے زہر ہے موجِ سرور تک

کیسی رُکی رُکی سی ہے اس زندگی کی رَو

کتنی بجھی بجھی سی ہے شمعِ طرب کی لَو

اللہ رے زندگی کا نظر آفریں جہاد

جام و سبو کو دیکھ کے آتا ہے خون یاد

کیسے میں یہ کہوں کہ نہیں جانتا ہے تو

ارزاں تری شراب سے انساں کا ہے لہو

تیری نظر تو ناقدِ رازِ حیات ہے

تیرے مشاہدے میں تو اک ایک بات ہے

انساں کے غم میں خون جلایا گیا ہے تو

بہتر جو راہ ہے وہ دکھایا گیا ہے تو

رستہ بدل کے عیش کی منزل پہ جا شراب

سنگیں حقیقتوں کو فسانے بنا شراب

ہے ابرِ تیرہ سایہ فگن کائنات پر
لہرا رہا ہے موت کا پرچم حیات پر

میں دیکھتا ہوں خون میں لتھڑی جوانیاں
سنتا ہوں روز درد میں ڈوبی کہانیاں

کتنے دلوں میں حسرتِ فردا بنی ہے داغ
اکثر اندھیری رات میں گل ہو گئے چراغ

سونے کے زرد زرد خداؤں کا راج ہے
محنت کشوں کے فرق پہ کانٹوں کا تاج ہے

آندھی کی زد پہ آج تمدّن کا ہے چراغ
لو دے رہا ہے سینۂ انسانیت کا داغ

جھلسی ہوئی ہے نکہتِ گل گرم ہے ہوا
دم گھٹ رہا ہے ذہن کا مسموم ہے فضا

ہے عقل و دل پہ سایۂ افکار کیا کہوں
یاد آ رہے ہیں تیرے ہی اشعار کیا کہوں

"بیگانۂ حقیقتِ انفاس ہوشیار
"ہر سانس ایک عالمِ صد انقلاب ہے
"ہر جنبشِ نگاہ ہے اک انقطاعِ فصل

"ہر لمحہ ایک منزلِ روزِ حساب ہے

"جی بھر کے بزمِ عیش میں ارمان کا غبا

"اچھا سا اک خیال پریشاں سا خواب ہے

(جوش

تو نے یہ کہہ کے آگ لگائی ہے بارہا
تیری صدا دماغ پہ چھائی ہے بارہا
ذوقِ عمل کو یونہی ابھارا کیا ہے تو
تصویرِ آرزو کو سنوارا کیا ہے تو
پردہ نگاہِ شوق پہ اب ڈالتا ہے کیا
جب تو نے خود حیات سے پردا اٹھا دیا
بزمِ طرب میں ساتھ ترے کیسے ہوں بہم
جب زندگی کے بوجھ سے اٹھتے نہیں قدم
دل چاہتا ہے صاحبِ فکر و نظر ہوں میں
بڑھ کر جہادِ زیست میں سینہ سپر ہوں میں
مانا بدل سکوں گا نہ میں نظمِ کائنات
ممکن ہے ساتھ ہی نہ مرا دے مری حیات

ممکن ہے ڈوب جائے ستارہ امید کا

فتح و ظفر کی آئے نہ میری طرف ہوا
منزل پہ جا سکوں گا نہ میں اس کا غم نہیں
لیکن عمل کی راہ میں چلنا بھی کم نہیں

مرتا ہوں راہِ زیست پہ چلنے ہی دے مجھے
علم و عمل کی آگ میں جلنے ہی دے مجھے
تو بے خبر ہے اس سے تو اے دوست حیف ہے
میرے غرورِ تشنہ لبی میں بھی کیف ہے!
سنہ ۴۲ء

اعتراف

اے ضمیرِ فکر دل پر آج کیسا بار ہے
اک اندھیرا روشنی سے برسرِ پیکار ہے

کھو رہا ہوں کچھ یہ رہ رہ کر گماں ہوتا ہے کیوں
ہر قدم پر مجھکو احساسِ زیاں ہوتا ہے کیوں؟

جو نظارے صاف تھے کیوں ان پہ چھایا ہے دھواں
کس نئی منزل پہ پہونچا زندگی کا کارواں

نور کی ہلچل ہے کیوں آخر حجاب اندر حجاب
زندگی خود کیوں اُلٹ دیتی نہیں بڑھکر نقاب

سانس سینے میں مرے لیتی ہیں کیوں ویرانیاں
کیوں گریبانِ یقیں پر ہاتھ رکھتا ہے گماں

خوفِ نامعلوم کی دل سے خلش جاتی نہیں
آرزو بے پردہ ہو کر سامنے آتی نہیں

تھا ابھی کل تک جو رہبر وہ جنوں کیا ہو گیا
راستہ قدموں کے نیچے سے یکایک کھو گیا

کیوں تبسم کا گلا گھٹتا ہے میری فکر سے
کیوں لطافت اڑ گئی حسن و وفا کے ذکر سے

کیوں محبت کے تصور میں مزا ملتا نہیں
غنچۂ دل سامنے اُن کے بھی کیوں کھلتا نہیں

کیوں سکوں نا آشنا تنہائیاں بھی ہو گئیں
نیند جو لاتی تھی میٹھی کیا وہ راتیں سو گئیں

کیوں عزائم کی مرے دنیا جواں ہوتی نہیں
جس زمیں پر ہیں قدم کیوں آسماں ہوتی نہیں

اک نئے ذوقِ تحیّر کی ہے دل میں ابتدا
گو ابھی جل جل کے بجھتا ہے اُمیدوں کا دیا

ہے یقیں لیکن کہ اس غم سے رہائی پاؤں گا
اک خزاں دیدہ شجر ہوں پھر ہرا ہو جاؤں گا

سنہ ۴۶ء

ایک یادگار رات

آج بھی تم کو کیا وہ رات ہے یاد
دل پہ جو نقش ہے وہ بات ہے یاد
مست و سرخوش مری جوانی تھی
ہر گھڑی عمر کی سہانی تھی
شاد و شاداب تھا تمہارا شباب
ہر ادا سے برس رہی تھی شراب
روح کو ایسی شادمانی تھی
خود محبت سے بدگمانی تھی
ضو لئے سیکڑوں بہاروں کی
چاند نکلا جلو میں تاروں کی
پاس مہتاب کے تھا یوں بادل
جیسے رادھا کے دوش پر آنچل

تھی فضاؤں میں نغمہ ریز ہوا
ایسے میں تم نے بھی بہ پاسِ وفا
گیت سا مجھ کو اک سنایا تھا
میرے سازِ طرب پہ گایا تھا
کیا ترنم تھا کیا روانی تھی
جیسے ہر چیز پر جوانی تھی
اسی نغمہ میں کھو گیا تھا جہاں
لے کے دامن میں سو گیا تھا جہاں
آج ہو تم وہی وہی میں ہوں
دل پہ طاری نہیں مگر وہ جنوں
یوں بجھے سے ہیں ولولے دل کے
جیسے کجلا گئے ہوں انگارے

زندگی پھر نہ مسکرائے گی!
کیا وہی رات پھر نہ آئے گی؟

مسکراؤ اسی طرح اک بار
اور گاؤ اسی طرح اک بار

کل، آج اور کل

کل جس کو طاقِ دل میں جلایا تھا شوق نے
خود مجھ کو وہ چراغ بجھانا پڑا ہے آج
جن حسرتوں میں جان سی پڑنے لگی تھی کل
اُن حسرتوں کا خون بہانا پڑا ہے آج
کل جو محل بنائے تھے ذوقِ سکون نے
اُن کو خود اپنے ہاتھ سے ڈھانا پڑا ہے آج
ذوقِ سجود نے جو چنا تھا کل آستاں
سجدے سے اُس کے سر کو اٹھانا پڑا ہے آج
کل شعلہ ہائے جوشِ جنوں سر بلند تھے
اپنے ہی آنسوؤں سے بجھانا پڑا ہے آج
کل جو کلی کھلائی تھی جوشِ حیات نے
اس کو مسل کے خاک بنانا پڑا ہے آج

طالع ہوا جو کل مری قسمت کا آفتاب
ابرِ سیہ میں اُس کو چھپانا پڑا ہے آج

کل مجھ سے جس کو چھین کے پھینکا گیا تھا دور
مجبور ہو کے زہر وہ کھانا پڑا ہے آج

کل نقش جو بنائے تھے مل کر بصد نشاط
کس بے بسی سے اُن کو مٹانا پڑا ہے آج

جس کا خیال وجہ سکون و قرار تھا
اللہ! اُس کو دل سے بھلانا پڑا ہے آج

کل روشنی تھی آج اندھیرے کا دور ہے
لیکن جیوں گا میں کہ ابھی کل اک اور ہے

سنہ ۴۶ء

وہ چند لمحے!

یاس میں ڈوبی فضا دیکھ کے غم خانے کی
آگئی یاد ترے یک بہ یک آجانے کی

کون غم خانے میں آیا تھا چراغاں کرنے
غم سے بجھتے ہوئے دل کو شرر افشاں کرنے
یاس کے قصرِ جنوں خیز کو ویراں کرنے
کس کا سایہ در و دیوار پہ رقصاں تھا ابھی
کس کی آنکھوں کا فسوں خون میں جولاں تھا ابھی

لئے قدموں میں خوش آئند صدا کون آیا؟
میری جانب بہ صد انداز و ادا کون آیا
منتشر کرتا ہوا بوئے وفا کون آیا
کھول کر بند دریچہ مرے سینے کا ابھی
کس نے سامان کیا تھا مرے جینے کا ابھی

کون سُننے کو بڑھا تھا مرا افسانۂ غم
کس کی آنکھیں مرے احساسِ تباہی سے تھیں نم
کس نے کھائی تھی ابھی میری محبت کی قسم
کس نے بے نام اشاروں سے بلایا تھا قریب!
کس کے بازو کا ابھی مجھکو سہارا تھا نصیب!
کون تھا جس نے محبت کو زباں بخشی تھی
قلب کو گرمیٔ خورشیدِ جواں بخشی تھی
اپنی گفتار کے سائے میں اماں بخشی تھی
پھول ہنس ہنس کے کھلائے تھے بیاباں میں مر
دولتِ مہر و وفا بھر گئی داماں میں مر
کس نے کھینچا تھا جنوں زار سے مجھکو باہر
کس نے نظروں سے ابھی دی تھی محبت کی خبر
سی گیا کون مرا چاکِ گریباں ہنس کر
کس کی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں سویا تھا ابھی
آستیں کس کی بھگو دینے کو رویا تھا ابھی

یہی ویرانہ بہاروں کا ابھی مسکن تھا

اشک جو گرتا تھا اک گل وہ سرِ دامن تھا

ذرّہ ذرّہ پہ جوانی تھی جہاں روشن تھا

صاف شفّاف سی ہے موج مرے سینے میں

اب تک اک عکس جھلکتا ہے اس آئینے میں

میرے ہر تارِ نظر نے تجھے پہچان لیا

الفتِ خاک بہ سر نے تجھے پہچان لیا

گھر کی دیوار نے در نے تجھے پہچان لیا

کر کے روشن نہ بجھا شمع محبت اے دوست

زندگی میرے لئے پھر ہے مصیبت اے دوست

تجھ پہ کشمیر کی، جنّت کی ہوائیں قرباں

ماہتابوں کی، ستاروں کی ضیائیں قرباں

دل کے ٹوٹے ہوئے بربط کی نوائیں قرباں

آ پھر اک بار کہ جی جانے کی ڈھارس ہو جا[ئے]

گھر مرا شامِ اودھ صبحِ بنارس ہو جا[ئے]

۲۰-۷-۴۲

روشنی لاؤں کہاں سے!

وقت کی گود میں سوتے تھے ہزاروں فتنے
اب جو بیدار ہیں یہ اُن کو سلائے گا کون؟
جن ہواؤں میں الجھ جاتے ہوں امید کے خواب
راہ پر ایسی ہواؤں کو لگائے گا کون؟

یہ مچلتے ہوئے بادل، یہ اندھیری راتیں
کب افق چمکے گا کب دور اندھیرا ہوگا؟
دل ہے تاریک تو ہر وقت یہ کہتا ہے سوال
رات ہی رات رہے گی کہ سویرا ہوگا؟

برہنہ، بھوکے، ستم کیش غلاموں کے لئے
کوئی دولت نہیں کیا ظلم کی دولت کے سوا؟

ہر طرف مٹتے ہوئے شہر تڑپتی مخلوق
کیا زمانے میں نہیں کچھ بھی مصیبت کے سوا؟

رقص کرتا ہے سرِ راہ جنونِ وحشت
خون جبڑوں میں بھرے ہیں ابھی خونخواروں کے
یہ جہاں آگ بھی ہے اور یہی گلزار بھی ہے
پھول جھلسے نظر آتے ہیں سمن زاروں کے

کیوں ہوئی جاتی ہے سُرخی میں سیاہی شامل
کیوں گھُٹی جاتی ہے روحِ طربِ انسانی؟
قوتیں خیر کی سہمی ہوئی کیوں بیٹھی ہیں..
کیوں بڑھی جاتی ہے فتنوں کی جنوں سامانی؟

جس طرف دیکھئے تاریک فضا ہے اب تک
دیکھیں کس سمت سے ہوتا ہے اُجالا پہلے
نزع میں لوٹ رہے ہیں کئی اژدر اک ساتھ
دیکھئے لیتا ہے کون ان میں سنبھالا پہلے!

دل کے ویران کھنڈر میں ہیں مٹی سی راہیں
کچھ ارادے ہیں کہ ہر بار کھٹک جاتے ہیں
کتنی مایوسی کے جذبات ہیں سینے میں مرے
کتنے کانٹے ہیں کہ رہ رہ کے کھٹک جاتے ہیں

چاہتا ہوں کہ غم و یاس کی باتیں نہ کہوں
آہ اس طرح کروں میں کہ نہ سن پائے کوئی
یوں صنم توڑ دوں ظلمت کے کہ اب حشر تلک
روشنی کے لئے محتاج نہ رہ جائے کوئی

لیکن اب تک یہ سمجھ میں نہیں آیا اے دوست
کیسے مرجھائے ہوئے دل کو شگفتہ کر دوں
روشنی لاؤں کہاں سے کہ بہ اندازِ طرب
روح کے سرد اندھیرے کو ضیا سے بھر دوں

سنہ ۴۷

عزائمِ کوہکنی

ہجومِ شوق ہے، ذکرِ گل و بہار کریں
نشاطِ جاں پہ غمِ دہر کو نثار کریں

صبا کے ساتھ پیامِ بہار لے کے چلیں
چمن کے غنچۂ نورس کو ہوشیار کریں

خزاں کے خوف سے رنگ اڑ رہے ہیں پھولوں کے
جہاں کہیں نظر آئے خزاں پہ وار کریں

چلائیں وادیٔ شام و سحر میں ایسی ہوا
جھلس گئے جو چمن اُن کو لالہ زار کریں

عطا ہو پیکرِ ہستی کو اک نیا ملبوس
اسی جنوں میں گریباں کو تار تار کریں

شبوں میں لے کے چلیں تیز مشعلوں کے جلوس
سحر نہ آئے تو اس کو بھی شرمسار کریں

ہم عہدِ نو کے مسافر ہیں رک نہیں سکتے
ہو رات ختم کہاں تک یہ انتظار کریں
نجوم و شمس و قمر دیکھتے ہی رہ جائیں
جبینِ ارض کو اس طرح نور بار کریں
حقیقتوں کے فسانے سنائیں دنیا کو
رُخِ یقیں پہ متاعِ گماں نثار کریں

یقینِ عشرتِ فردا نہیں تو کچھ بھی نہیں
نظر میں صبح کا جلوہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

جو بند رہ گئے سینوں میں آج گیت وہ گائیں
دھڑک اٹھے دلِ ارض و سما وہ دھوم مچائیں
جنوں کا تیشۂ نور رکھ کے دوش پہ نکلیں
ہر ایک وادی و صحرا میں جوئے شیر بہائیں
خود اپنے شوق سے اذنِ خرام لے کے چلیں
بڑھیں تو رفعتِ عرشِ بریں کو بھی شرمائیں
غرورِ کج کلہی عام کر کے دنیا میں
گدائے راہ کو اندازِ خسروی سکھلائیں

دکھا کے حال کے رُخ میں جمالِ مستقبل
وطن کی عظمتِ رفتہ کی آبرو بن جائیں

زمیں سے عشق ہے انساں سے پیار کرتے ہیں
متاعِ شوق انھیں پر نثار کرتے ہیں

سنہ ۶۲ء

دوبارہ کافی ھاؤس کھلنے پر

زندہ پھر آج جنونِ چمن آرائی ہے
رات پھر لے کے ستاروں کی برات آئی ہے
جھومتے رند چلے ہیں درِ میخانہ کھلا
ربطِ باہم کا سنوارا ہوا کاشانہ کھلا
بند تھا میکدہ، قفل اُس کا ہٹایا کس نے
گھپ اندھیرے میں دیا آج جلایا کس نے
حکمتِ پیرِ مغاں چارہ گرِ درد ہوئی
جو تذبذب کی گھٹا چھائی تھی سب گرد ہوئی
کھل اٹھے پھول، ہنسے جام، فضائیں مہکیں
پھر تلاشِ رخِ یاراں میں نگاہیں بہکیں
ذوق یوں جاگ اٹھا انجمن آرائی کا
سلسلہ ختم ہوا بادیہ پیمائی کا

دلِ آوارہ کو سو طرح سے بہلاتے تھے
دیکھکر بند درِ میکدہ لوٹ آتے تھے
کشتیٔ شوق کو اب ایک کنارا تو ملا
دو گھڑی لطف اٹھانے کا سہارا تو ملا
وہی مانوس نگاہیں وہی مانوس فضا
مشترک ہند کی تہذیب نظر آتی ہے
نوجواں آتے ہیں، طفل آتے ہیں پیر آتے ہیں
سب خمِ زلفِ محبت کے اسیر آتے ہیں
جن سے محروم تھے وہ جام یہاں ڈھونڈیں گے
اپنی کھوئی ہوئی ہر شام یہاں ڈھونڈیں گے

تشنۂ ذوقِ سخن، علم و ہنر کے پیاسے
دل کے مارے ہوئے تسکینِ نظر کے پیاسے
رند ہر رنگ کے کھنچ کھنچ کے یہاں آتے ہیں
ظرف جیسا بھی ہو بھر لیتے ہیں اُٹھ جاتے ہیں
ایک جا ہو گئے پھر بے خود و ہشیار یہاں
آج پھر جمع ہوئے شاعر و فنکار یہاں

بے زباں جرأتِ گفتار یہاں پاتے ہیں
لطف ملتا ہے اگر مات کبھی کھا جاتے ہیں

یاں نگاہوں سے پیامِ دل و جاں بھی آئے
پھول بھی آئے یہاں سنگِ گراں بھی آئے

امن کا راگ بھی ہے نعرۂ پیکار بھی ہے
سرفروشوں کو نویدِ رسن و دار بھی ہے

درد والوں کو یہاں درد کا درماں بھی ملا
تیر جو بن کے کھٹکتا ہے وہ ارماں بھی ملا

کتنے اس بزم میں شوریدہ سری سیکھ گئے
کم نظر آئے تھے بالغ نظری سیکھ گئے

دل کے گوشوں میں یہاں شمعِ وفا جلتی ہے
کوئی موسم ہو یہاں بادِ سحر چلتی ہے

رند ہر رنگ کے اس بزم میں ملتے دیکھے
پھول سو رنگ کے اس باغ میں کھلتے دیکھے

اپنے قبضہ میں چلو گردشِ ایام کریں
میکشو آؤ وہی رسمِ جنوں عام کریں

میکشوں کی یہی جنت بھی جہنم بھی یہی

وادیٔ افسوں

ایک مبہم سا محبت کا اشارہ پا کر
جنتِ شوق مرے دل نے بنا ڈالی ہے
میں نے سمجھا تھا کہ اس وادیٔ افسوں میں خزاں
گر کبھی آئی تو دم توڑ کے رہ جائے گی!
میں نے سوچا تھا کہ افلاک پہ ڈالونگا کمند
ذرہ ذرہ کو مہ و مہر بنا ڈالوں گا
میں نے جانا تھا ستاروں کی جبیں چھو لونگا
اپنے ہاتھوں سے سنواروں گا میں زلفِ ہستی

بے حسی شعلۂ گفتار ہیں جل جائیگی

(نامکمل)
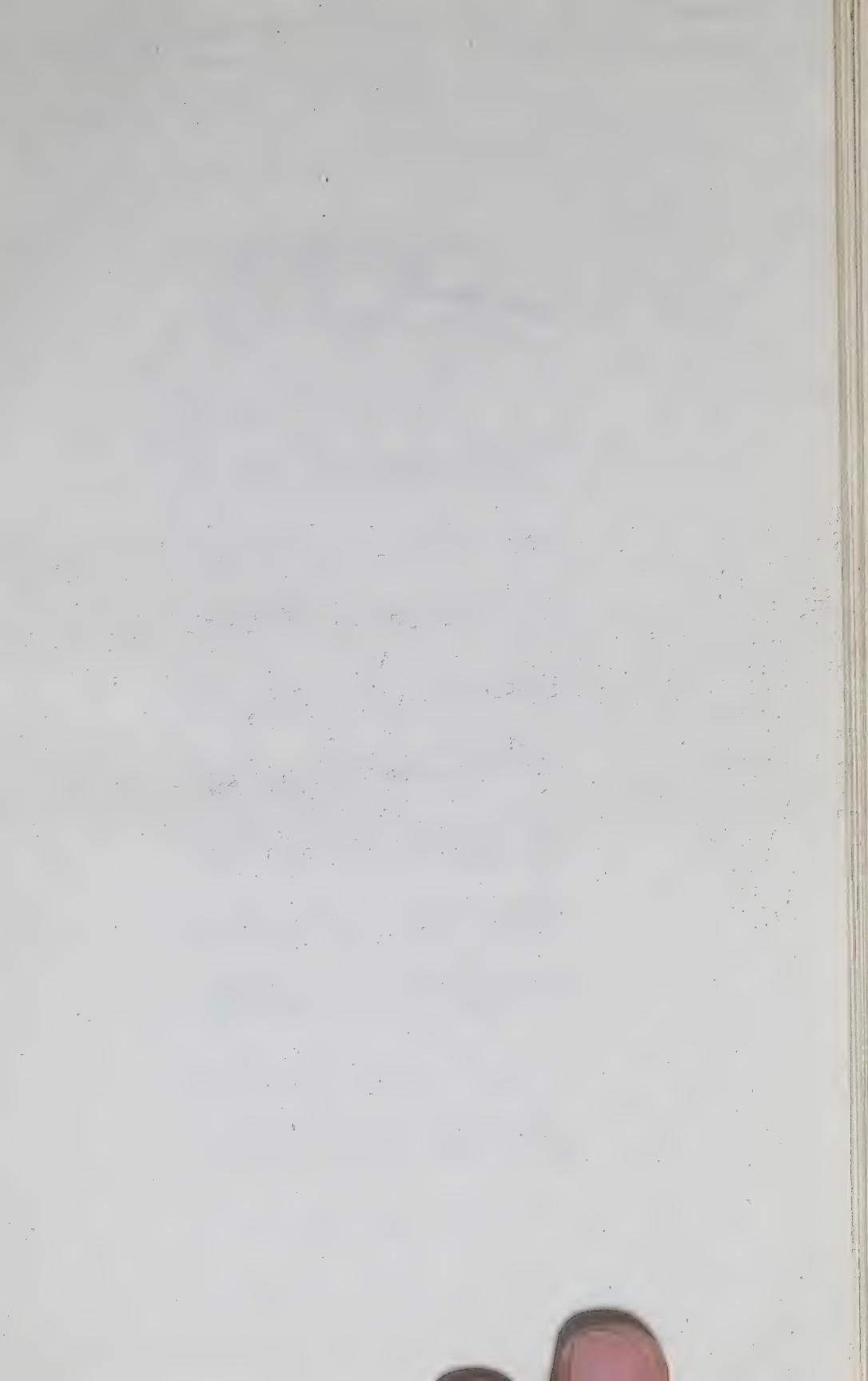
الف۔ ج۔ نورِ ازل کے فرضی نام سے
شائع ہونے والی نظمیں

○

کون ہے خالق ان نظموں کا ؟

فرد

دستِ خیال

ساحرالموت

جنون و خرد

سبز رنگ

حقیقت پسندی

ایک خواب

ایک ہی کشتی میں

لہو کا سفر

بے چارہ !

ہجرات

ملکۂ شب

آندھی

نقطہ

کھوکھلے اصول

ورقِ ناخواندہ

ایک تصویر

زرد رنگ سرخ رنگ

تخلیق

میری پہچان

نیند سے پہلے

کیڑے

وہم

خشک سالی

ندائے کہسار

ریاکاری

ردا

سایا اور سورج

کون ہے خالق ان نظموں کا؟

کون ہے خالق ان نظموں کا
اس کو جان کے کیا پاؤ گے!
کیا وہ ان لفظوں میں نہیں ہے؟
جن کے لمس سے ذہن و قلب تمہارے جاگ اُٹھے ہیں؟
فرض کرو وہ کوئی نہیں ہے
رنگوں کا اک مجموعہ ہے موسیقی ہے، رقصِ صدا ہے
آوازوں کا اک طوفاں ہے
(کیا نہیں سمجھے؟ اچھا پھر کچھ ایسا سمجھو!)
وقت کے دریا میں بہتا اک زندہ شعلہ
نورِ ازل کی ایک علامت، وارثِ ذوقِ گناہِ آدم
معمولی سا اک انساں ہے
جس نے کرب و مسرت کی دنیا میں

مرگ دزلیست کا زہر پیا ہے

جس نے تخلیقی لمحات میں اکثر
پھولوں کی آواز سنی ہے لفظوں کی خوشبو سونگھی ہے
چاندکی کرنوں کی ٹھنڈک کو چکھ کر بھی محسوس کیا ہے
ساز بجے تو آنکھوں نے سنگیت کی لہریں دیکھی ہیں
جس نے
رقص کو اک پیچیدہ نظم کی صورت
بحر و وزن میں ڈھلنے کا نظارہ کیا ہے
اس کو جان کے کیا پاؤ گے، اس کو دیکھ کے کیا سمجھو گے
اُس کے درد و کرب کو دیکھو
اُس کے لفظ و خیال کو سمجھو!

پھول اور پتھر ہاتھ میں لے کر شہر کی گلیوں میں پھرتا ہے
چہروں کی شکنیں پڑھتا ہے، نظروں کی باتیں سنتا ہے
اُس کی فکر کے آئینے میں ہر تصویر چمک جاتی ہے
اُس کے ذہن کی دھرتی میں ہر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے
وہ نغمہ ہے، وہ دھرتی ہے
وہ طائر ہے جسم بھی ہے اور روح بھی ہے وہ

وہ شاعر ہے، وہ انساں ہے

تم نے اُسے دیکھا بھی ہوگا

اور اگر وہ صرف صدا ہے

اُس کو جان کے کیا پاؤ گے، اس کو دیکھ کے کیا سمجھو گے!

کیا وہ اِن شعروں میں نہیں ہے؟

○

فرد

اِس جنگل میں سب ہی اکیلے
یوں دیکھو تو کتنے پیڑ
اُونچے نیچے، موٹے پتلے، گھنی ہری ڈالوں والے
سوکھی ٹہنی، تنے میں غار

لیکن پھر بھی
ایک پیڑ اور ایک ہی جڑ
دیکھو تو ہر پیڑ اکیلا، اپنے ہی پیروں پہ کھڑا ہے
اُسی کے پتّے، اُسی کے پھول۔

دورِ خزاں ہر پیڑ نے جھیلا
لطفِ بہار ہر اک نے اٹھایا
سر جوڑے سب پاس کھڑے ہیں
لیکن پھر بھی اکیلے ہیں
کیا انساں بھی پیڑ ہی ہے ؟

دشتِ خیال

ریگزاروں میں مرے ساتھ چلو
یہیں کھلتے ہیں کنول غم کی تمناؤں کے
یہ پیاس بڑھ جاتی ہے، دل بجھتا ہے
اور اس دشت کی پہنائی میں
اپنی ہستی کی لکیر، اپنی خودی کی تصویر
ریت کے ذرّوں کے آئینے میں
صاف شفّاف نظر آتی ہے بارہا اُن میں چلا ہوں میں بھی
ہے یہ آئینۂ فکرِ انساں
جس میں صدیوں سے ہیں جذب
رازِ انساں کی تگ و تاز کے لیکن
رہنماؤں کے نشاں ہیں نہ میرے نقشِ قدم
وقت کے بعد گو بجتے طوفاں نے مٹایا سب کو

ہے یہی جادۂ سرمستیِ شوق

خوفِ گمراہی، نہ منزل کا نشاں

ابھی چلتے ہی چلے جانا ہے

چل سکو تم تو میرے ساتھ چلو

آگے شاید کوئی گلزار ملے

○

ساحرِ الموت

کون یہ کھیل رہا ہے مرے ارمانوں سے
زندگی ڈھونڈتے انسانوں سے
ہم سے دیوانوں سے

آندھیاں زرد، جنوں خیز، رواں کف بہ دہاں
ہر طرف سُرخ عقابوں کے پرے
خوں میں لتھڑی ہوئی لاشوں پہ گدھوں کی پرواز
آدھ کٹے جسم، سڑی لاش، ہجومِ فریاد
اور پھر ساحرِ الموت کی جنّت کا فریب
جن کا پھیلا ہوا جال مجھ کو پرواز سے پہلے ہی پھنسا لیتا ہے
اک بڑا ساحرِ الموت کہیں اور جو ہے
اُس کی جنّت بھی فریب

جنون و خرد

کشمکش زیست کی، ارمانوں کی

حُسن کی، خوف کی، اُمید کی، پیمانوں کی

عقل نے دور تلک راہبری کی لیکن

گر پڑی تھک کے خزاں دیدہ ثمر کی صورت

پھر اُٹھی، لے کے مجھے ساتھ چلی، دشت و کہسار میں، ایوانِ خرد کے اند

کارخانوں میں، گزرگاہوں میں

سحر ورزیدہ کتب خانوں میں ـــــ

اور پھر ہار گئی ـــــ سر جھکائے ہوئے یہ کہہ کے گئی ـ

اس جگہ میرا سفر ختم ہوا

تیرا سفر باقی ہے!

میں جو مایوس ہوا،

پاس سے جذبۂ بیباک کی آواز آئی

کیوں ہے لرزیدہ جو منزل کے سراب

کھینچ کر تجھ کو لئے جاتے ہیں، اپنی لہروں میں

جگہ دے کے تجھے

جاوداں کر دیں گے۔

○

سبز رنگ

(چند سیاسی اشارے)

یوں تو ہر رنگ میں جی سکتے ہیں
ہو کسی رنگ کی مئے، زیست کی
پی سکتے ہیں
سرخیٔ خوں جو گھٹی، زردیٔ رخسار بڑھی
ہٹ گیا نور تو ظلمت یہ جھکی
ہاں مگر بانکپن کچھ اور ہی ہے سبز پرچم کی مرے
زندگی بخش، جواں سال بہاروں کا رنگ
جذبۂ کوہکنی، تیشہ زنی، دِل فگنی
سبز پتّی نے پہاڑوں کے جگر کاٹ دیئے
بن کے الماس کبھی اور کبھی خنجر بن کے

بن گیا زہر ستم گر کے لئے

ان پہاڑوں میں صنم بھی نہ رہے

سبز ہے رنگ مرا، مرے ارماں کا بہاروں کا یہ رنگ

سبزۂ آغازئ محبوب کا رنگ

اور پھر زہر کا رنگ

مرگ بھی، زیست بھی ـــــ سب کچھ اُسی اڑتے ہوئے سبزے کا

○

حقیقت پسندی

حقیقت پرستو!

خبر بھی ہے تم کو حقیقت کہاں ہے!

سمندر کی جھاگوں سے نکلی نہ کوئی حسینہ

نہ کیلاش کی اونچی چوٹی پہ شیو ہے

اپالو کی رتھ ٹوٹ کر کھو گئی ہے

ابوالہول ساکت ہے

لیکن

جو میں بولتا ہوں تو یہ بولتے ہیں

یہ سب میری رگ رگ میں اُترے ہوئے ہیں

مرا رابطہ ہے سمندر سے، پربت سے، غاروں سے

اونچے ستاروں کے بجھتے چمکتے چراغوں سے

میں جانتا ہوں، اپالو کو وینس کو اور شیو کو

مجھے الپسراؤں کے مسکن کی راہیں ہیں معلوم
میں لیلیٰ سے، شیریں سے، عذرا سے، رانجھا سے بھی مل چکا ہوں
مرے دامنِ شاعری میں ہیں صد رنگ پھولوں کے
لاکھوں کردار دل ستارے
انھیں جوڑ کر میں حقیقت بناتا ہوں اور پھر
مٹاتا ہوں یوں، جیسے تھے ہی نہیں وہ۔

ایک خواب

ایک شب

ایک محل —

(جو بہ یک وقت ہے آباد بھی اور ویران بھی

جلوہ صبح لئے، حسن شبِ ماہ لئے —)

بن گیا میرا مکاں

اس میں عفریت ہیں، جنّات بھی، شیطان بھی ہیں

مجھ کو کاندھے پہ اٹھائے لئے پھرتے ہیں در و بام کے نیچے

کچھ حسینائیں جھروکوں سے بلاتی ہیں مجھے

ڈر سے عفریت کے چھپ جاتی ہیں

اور کچھ دور پہ اک افعیٔ پرہول و سیاہ

رقص کرتا ہے جو جھرمٹ میں حسیناؤں کے

کھینچ لیتا ہے مجھے اپنی طرف ——

اُف میں جلا جاتا ہوں!

سانپ اک برہنہ انسان نظر آتا ہے

حُسن ڈھل جاتا ہے کیڑوں میں، درندوں میں تمام

اُسی منزل پہ کوئی مجھ کو جگا دیتا ہے ——

ابنِ آدم ہوں میں۔

ایک ایک کو پہچان گیا ——

ہائے احساسِ گناہ!

اب تو خوابوں میں بھی جینے نہیں دیتا مجھ کو۔

ایک ہی کشتی میں

میں ـــــ

کہ رہتا ہوں سیہ خلانے میں

پاس میرے نہ اثاثہ ہے نہ ستّارِ عیوب

نم زدہ ایک پُرانا بستر

جس پہ پڑ کر کبھی سوچا تا ہوں کبھی لکھتا ہوں کبھی کھاتا ہوں

کبھی کچھ اور بھی کام آتا ہے یہ نم زدہ بستر میرا

اسی ویران سیہ خلانے میں

موت نے جھانک کے مجھ سے یہ کئی بار کہا

جلد چلنے کے لئے ہو تیار

تُو ـــــ

کہ ہے قصرِ ارم پاس ترے

حبس میں خس خانۂ دبرفاب بھی ہے
ریشمی پردوں کے پیچھے ہے مچلتا ہوا حُسن
دوشِ ساقی پہ مۓ عقل گداز آتی ہے
ہر طرف خیل و حشم
ہر طرف سیلِ سکوں
ہر طرف مژدۂ خوش رنگینیٔ سامانِ بہار
لیکن اک دن ترے اک چاہنے والے نے کہا
اور خوش ہو کے کہا ــــ تو ہے اب پابہ رکاب

تیرے ایوان میں بھوتوں کا عمل
میرا ویرانہ بھی آسیب زدہ

لہو کا سفر

تجھے جو ریل میں دیکھا تھا اک ہجوم کے بیچ

نہ جانے کون تھے وہ

رقیب تھے کہ محافظ، عزیز تھے کہ حبیب

انھیں خبر نہ ہوئی

بچا کے اُن کی ہوسناک خشمگیں نظریں

میں لے گیا تجھے کُنجِ خیال میں اپنے

تجھے خبر بھی نہ ہوگی کہ تجھ پہ کیا گذری

رقیب دیکھتے ہی رہ گئے

لہو مگر تری دوشیزگی کا بہہ نکلا

سفر تو ختم ہوا تیرا اور میرا کبھی

مگر تری انھیں نظروں کی سحر کاری سے

سفر میں ہے مرے اعصاب کا لہو اب تک

بے چارہ!

ہوں میں اک طائرِ کب رشتہ بپا
چل کے کچھ دور ہی گر جاتا ہوں
زخموں سے رستے ہوئے پاؤں میں زنجیرِ حیات
دامِ ماحول کے کستے ہوئے بند
اُڑنا چاہوں تو الجھ کر رہ جاؤں

چشم بینا بھی ہے اور گوش بھی ہے شمع نواز
رگِ ارماں میں لہو بھی ہے رواں
فکر ہر لمحہ پر افشاں سرِ راہِ تحقیق
کیا کروں زخموں کو زنجیروں کو
کیسے ماحول کے تابوت سے باہر نکلوں
کیسے پرواز کروں
اُف
یہ زنجیر، یہ تابوت، یہ ناسور، یہ ساعت کی کمند

ہجرت

مدتوں آگ سُلگتی رہی زیرِ گلشن،
کوئی جاگا، کوئی سویا، کوئی مدہوش رہا
آنچ محسوس ہوئی، سرد ہوائیں بھی چلیں
یک بیک شعلۂ بیباک جہنم بھڑکا
اور بھگدڑ سی ہوئی، سارا چمن روند اُٹھا
پاؤں سر پہ تھے کہیں اور کہیں پاؤں پہ سر
سیل اپنے ہی نشیبوں کی طرف بہ نکلے
راہیں پہچانی ہوئی، آگ کا دریا نکلیں
زخم پہ زخم لگے، گھاؤ پہ گھاؤ

پاؤں کٹے رہنے سُراڑتے رہے درد پتھر کی طرح
جسم کے بنا کوہ گراں
حُسن مجروح ہوا عصمتیں داغ کا انگارہ لئے پاک رہیں
راہِ دوزخ ہی پہ چلنے میں نظر آئی نجات
شور محشر تھا مگر، چیخیں بجھ بجھ سی گئیں
انگنت روحوں کی آواز خلاؤں میں بھٹکتی ہی رہی
اور جب آگ کے دریا سے نہا کر نکلے
جسم اپنا نہ ملا
اجنبی جسموں کے انبار میں کچھ جسم ملے ــــ اور
بھٹکی روحوں کا یہی مسکن تھے۔

○

ملکۂ شب

رات کی رانی کالا دوشالہ اوڑھ کے نکلی
کالے نور سے چہرہ روشن
انگ انگ میں جیون کا رس
پیشانی پر چاند کا جھومر، مانگ میں تاروں کی افشاں
دھیرے دھیرے الٹ کر گھونگھٹ
عطر ملے ترغیب گنہ کا، مست بناتی، دل کو لبھاتی آتی ہے
جو بھی آئے، اپنی ردا میں سب کو جگہ دے
نیک بھی اس میں، بد بھی اس میں، اس میں جو نہ بھی مجرم بھی
اس کے نیچے زاہد و عابد سب کو جگہ مل جاتی ہے
دل کی کلی کھل جاتی ہے
مجرم، زانی، عابد، زاہد

سب کی بات بن آتی ہے
رات کی یہ جمہور نوازی دن کا مذاق اُڑاتی ہے
اُس کے سایہ میں سب آباد
مسجد بھی میخانے بھی
اس کی بزم میں سب آزاد
شمعیں بھی پروانے بھی

آندھی

پچھم سے کل اک گرد اُٹھی طوفان لئے

کہساروں سے ٹکر کھاتی، ندیوں میں الٹتی ناؤں کو

پیڑ گراتی، پھوس کے گھر کو آگ لگاتی

کچھ صوفوں پر گرد جمی کچھ چاند سے ماتھے زرد ہوئے

بجلی کے کھمبے اُکھڑ گئے، بازار کے دھندے سرد ہوئے

بچے روئے، مائیں چیخیں

زن مرید گھروں کو بھاگ چلے

اک ہلچل تھوڑی دیر رہی

جب صبح ہوئی، ہر چیز وہی تھی جیسی تھی

پر دل میں جو آندھی اُٹھتی ہے، اُس سے کتنے آگاہ ہوئے

کتنوں نے جانا کیا گذری؟

اس آندھی میں
اُمیدوں کے ساغر ٹوٹتے ہیں
جذبات کے رشتے کٹتے ہیں
کچلے ارمانوں ٹوٹے خوابوں کے ملبے کا ڈھیر
کچھ ایسا رہ جاتا ہے
جس پہ نئی تعمیر کا امکاں کوئی نہیں ــــ

○

نقطہ

لکیر ایک ہی ہے
وہ منحنی ہو کہ سیدھی

لکیر ایک ہی ہے
کبھی طویل کبھی مختصر کبھی چوکور
بہت سے نقطوں کی زنجیر، ٹوٹتی جڑتی
اُلجھ کے بنتی ہے علم حساب و اقلیدس

وہ ایک نقطہ جو موہوم بھی ہے اصل بھی ہے
اسی پہ رقص کناں ہے یہ کائناتِ عظیم
اسی سے کارِ جہاں کا سبک خرام وجود
یہ بینکوں کی عمارات، دفتروں کے پہاڑ
سبھی اسیر ہیں نقطوں کی ان لکیروں میں
انھیں سے بنتے ہیں ایٹم، انھیں سے حرف و صدا

بڑھیں تو لامتناہی طِلسم بن جائیں
گھٹیں تو ایک صفر ——

مری حیات ہے اک نقطۂ حقیر مگر
لئے ہوئے ہے طِلسم وجود و وہم عدم
بڑھے تو دائرۂ ممکنات کو گھیرے
گھٹے تو کچھ بھی نہیں۔

کھوکھلے اُصول

طرفگیِ رسم و رہِ عام کی مت پوچھ ندیم
جھوٹ جو مصلحت آمیز ہو سچائی ہے
سچ کی تلخی پہ ستم کے ڈونگرے
نور و ظلمات، جسے چاہتے ہیں پوجتے ہیں
اور کر لیتے ہیں ہر بات کی توجیہہ نئی
دوسروں کا نہ سنیں اور نہ تسلیم کریں عذر کوئی
یہی قانون، یہی عدل، یہی حکمت ہے
یہی اخلاق کے تابندہ اصول

جب ازل میں بنی تقدیر بنی آدمؑ کی
اُس میں تحریر ہوا
جس کی لاٹھی ہے اُسی کا قانون

جس کی تلوار اُسی کا اخلاق

اور

قانون پرستاری الفاظ سے باہر کیا ہے
درسِ اخلاق حقائق سے گریز
رُوح ننگی ہو تو اخلاق کی زد سے باہر
جسم عریاں ہو تو قانون کے کوڑوں کا شکار

ورقِ ناخواندہ

"کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ"

— مرزا غالب

یہ جو غالب نے کہا
ہے یہی اصل میں گنجینۂ معنی کا طِلسم
کتنے نیرنگ حقائق کے نہاں ہیں اس میں
کبھی سوچا تم نے ؟
ملتے جلتے ہیں سبھی ظاہر میں
آنکھ سے دیکھتے ہیں، کان سے سُن لیتے ہیں
ہاں مگر یہ تو بتاؤ
میں نے جو دیکھا ہے کیا تم نے بھی دیکھا ہے وہی اور سُنا بھی ہے در
کثرتِ شوق میں پس جاتے ہیں ارمان تمہارے کتنے
مجھکو معلوم نہیں۔

کتنے تخلیق سے پہلے مرے سینے ہی میں مر جاتے ہیں

تم کیا جانو ــــــ

سطحِ جذبات کے نیچے کیا ہے

کس کے ہاتھوں میں ہے اس شورشِ تحریک کی باگ

خواہشوں کے جو یہ طوفاں ہیں کدھر جاتے ہیں

میں نے تو پی لیا وہ زہر جو دنیا نے دیا

تم نے بے لب سے لگائے ہی اُسے پھینک دیا

تم چڑھے جاتے ہو کہساروں پر

مجھ کو تو ان کی بلندی ہی سے خوف آتا ہے

دیکھ لیتا ہوں میں ہر پردے کے پیچھے کیا ہے

یا سمجھتا ہوں کہ دیکھا میں نے

سوچتا اور الجھ جاتا ہوں

تم کہ پردے ہی کی رنگینی میں کھو جاتے ہو

آسودہ ہو!

پڑھ سکے تم نہ کبھی میری تمنا کی کتاب
اور نہ میں ہی تمہیں پہچان سکا
ناخنِ فہم و خرد سے نہ کھلا قربت و دوری کا طلسم
کیا یہی سچ ہے ہمدم
"ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ؟"

ایک تصویر

پیڑ ہیں جانکنی کے عالم میں
ڈالیوں کی کمر خمیدہ ہے
خشک کلیاں ہیں بے بصر آنکھیں
پتّیاں سوکھ کر ہوئیں مبروص
پھول ہے یا کوئی پھٹا ہوا دل
جڑیں کبڑے فقیر کی ڈاڑھی

پیکرِ حُسن بے نمو جیسے
عشق محرومِ آرزو جیسے

○

زرد رنگ سُرخ رنگ

زعفراں زارِ محبت میں قدم رکھتے ہیں
اڑ گیا رنگ مِرا
ہنس پڑے دیکھنے والے مجھ کو
پھول ہنستے ہیں، سحر ہنستی ہے
اور مرے زرد تبسّم میں یہ چھپی بیٹھی ہے تاریکیٔ غم
تم بھی ہنس دو تو تمنّا کا لہو
زردیٔ رُخ پہ مرے
سُرخ صیقل کردے
پھر مرے زرد تبسّم میں تمنّا کا لہو
اک نیا رنگ بھرے
دیکھنے والے مجھے دیکھ کے حیران رہیں
سچ یہ ہے
رنگ کی پہچان بڑی مشکل ہے

تخلیق

خاموشی کی گہرائی سے نکلی اک آواز
فضائیں گونج اٹھیں
گونجوں کے ٹکراؤ سے چنگاری نکلی
اور سورج دہکا
چاند بنے اور تارے چمکے
بادل گرجے، پانی برسا، پیڑ اُگے
دھرتی ماں کی کوکھ میں ہستی رینگی
آوازوں میں کلیاں پھوٹیں
بکھر گئے تخلیق کے جوہر ——
ہر جوہر میں اک ہستی لئے ہوئے تخلیق کی قوت
شوقِ نمو سے لرزاں لرزاں
ذوقِ نظر سے دست و گریباں

ہر لمحہ تخلیق کا چکّر
نئے کھلونے ڈھالتا ہے
جو بنتے ہیں، ٹکراتے ہیں، ٹوٹتے ہیں
شاید اک دِن
پھر خاموشی ہو
پھر تخلیق کے درد کی شدّت
گونج بنے
اور درد و نشاط کا کھیل انوکھا
چل نکلے

○

میری پہچان

میں سمجھتا تھا کہ تنہا ہوں میں
اور اس دشتِ پُرآسیب میں میری ہستی
ایک ویرانہ ہے، بے آب و گیاہ
پھول کھلتے ہیں، نہ آتی ہے بہار
لیکن
اس ہیئتِ بے رنگ کو تصویرِ خزاں بھی تو نہیں کہہ سکتے!
میری تنہائی کی پریوں کا نشیمن ہے یہی
ہر پری
آکے لُبھاتی ہے مجھے
دُور بھی رہتی ہے، نزدیک بھی آجاتی ہے
اور دُلھن بن کے مجھے کرتی ہے سرمستِ نشاط
دیکھتے دیکھتے ہی

سونا آنگن مری تنہائی کا بن جاتا ہے گلزارِ خیال
لیکن اک بار جو وقت
آ کے دے دیتا ہے دستک دل پر
چاہِ تنہائی میں ہو جاتا ہوں فی الفور اسیر
پھر وہی گرم ہوا، پھر وہی صحرائے مہیب
بس یہ پہچان ہے میری
کہ نکلتا ہوں کبھی خول سے باہر کبھی چھپ جاتا ہوں

نیند سے پہلے، سارے دن کی سہانی ہلچل، سارے جھگڑے
ہر ناکامی، ہر افتاد، ہر الجھن دل کی،
دیکھا ہوا ہر دلکش چہرہ، بگڑی صورت
سب ایک ایک سے ٹکر کھاتے
یاد میں گڈ مڈ ہوتے ہیں ——
جیسے کیچڑ میں کیڑے رینگیں ——
افسر نے اک بات کہی تھی، بیوی نے ایک طنز کیا تھا
بچے نے فرمائش کی تھی
اک ساتھی نے فلاں گلی کے موڑ پہ مجھ کو دیکھ لیا تھا
ساہوکار نے گالی دے کر، نالش کی اک دھمکی دی
فلاں دوست کا سوٹ دیکھ کر دل مچلا تھا

ایک حسینہ عاشق کی آغوش میں بیٹھی
مجھکو ہنس ہنس دیکھ رہی تھی ——

ساری باتیں، روشن روشن، دھندلی دھندلی
کڑوی کڑوی میٹھی میٹھی
اکثر ان میں شور مچاتی
کچھ ہونٹوں پر قفل لگائے
ذہن کے گوشے گوشے میں بس جاتی ہیں
پھر ان میں جھگڑے ہوتے ہیں
ایک کو ایک بھگاتی ہے
آنکھیں میچ کے بند کروں تو ان کی چبھن
پلکوں پہ دہکنے لگتی ہے

تخیل کی کھڑکی بند کروں تو زور سے دستک دیتی ہیں
کروٹ لے کر سونا چاہوں تو اور چمٹ سی جاتی ہیں
اُف دن بھر کی دل سوز تھکن
اُف نیند نہ آنے کی اُلجھن!
کیا کشتی ڈوبنے سے پہلے، خوابوں کی پری
ساحل پہ مجھے پہونچا دے گی؟

○

کیڑے

زیست کے یہ بے ڈھنگے نقطے
روئے زمیں پر
زمیں کے نیچے
جو سمائیں، بکھرے ہوئے ہیں
ٹیڑھے میڑھے، دبلے موٹے، گندے، چکنے
چمکیلے، بے رنگ، رنگیلے
کچھ غلیظ، کچھ پھول سے رنگیں
کچھ شیشے سے زیادہ نازک
کچھ پتھر سے بڑھ کر سنگیں
نیند کی ماتی چال سے چلتے
رینگ رہے ہیں
دوڑتے ہیں، اُڑ بھی لیتے ہیں

لیکن اُن کی ہستی کیا ہے !

وہ چڑیوں کا جُھنڈ اک نکلا

وہ لوگوں کا ریلا آیا

ان جلنے میں سب کو کچلتا، کھاتا پیتا

زلیست کی دولت چھین رہا ہے ——

بیچاروں میں دم ہی کیا ہے

چُپ چُپ سب کچھ سہہ لیتے ہیں

لیکن جب موقع پاتے ہیں

اکثر کاٹ بھی کھاتے ہیں !

○

میں نے خوابوں کے بیاباں سے نکلنا چاہا

سارے در بند ملے

اور اندھیرے کی چمک نے مری بینائی پہ شب خوں مارا —

یہ چھین کر میری نگاہوں سے بصارت، مرا نور

روشنی اور مجھے بخش دی ایک

وہ کبھی تاریک تھی راتوں کی طرح —

منجمد، سرد، سیاہ

روزنوں سے اس اندھیرے میں کوئی شے رینگی

(مجھے محسوس ہوا)

سرخ شعلوں کی زبانیں نکلیں

زنگ آلود سلاخوں سے ٹپکنے لگے خوں کے قطرے

یہ لہو کس کا ہے ؟

منجمد رات میں ٹھہرا ہوا تاریک سکوت

رقص میں ڈوب گیا

سہمے سہمے جو چھوا جسم کو اپنے'

تو مجھے

زیست کا احساس ہوا

ہوش نے لے کے اِک انگڑائی فسوں توڑ دیا

روشنی مل گئی واپس مجھ کو

درِ زندانِ بیاباں ٹوٹا

مری آواز ملی مجھ کو سرِ منزلِ صحرائے سکوت

اور نغمہ پھوٹا۔

○

خشک سالی

دھوپ کی جلتی چادر اوڑھ کے لیٹی دُکھیا کھیت کی رانی
پیتم نے منھ پھیر لیا ہے
دھانی ساری اپنی اُتاری پھینک دی رنگیں چولی
پھول کے گہنے پاتے پھینکے اور اُتارے زیور
آنکھوں کی جھیلیں سوکھی ہیں
دل کی رگوں میں خون نہیں ہے
گرد آلود ہے خاکی چہرا
سورج کی خونیں کرنوں نے جسم کا سب رس چوس لیا ہے
صحرائے بے رنگ میں درد و غم کی خاک میں لیٹی
چُپ سادھے ہے
کب دھرتی کی کوکھ جگے گی
کب اس کا پیتم آئے گا؟

ندائے کہسار

سیّاحو! مسافرو! میرے پاس آؤ، میں تنہا ہوں ہمیشہ سے
میں تمہارے پاس آؤں تو آ نہیں سکتا، اپنی پاگل زندگی سے چھٹکارا حا
کرنے کی کوشش کروں تو قیامت آجائے — تمہیں میری بات سنو،
میں ثابت قدم ہوں، یہیں ہوں، یہیں رہوں گا۔ میں نے کہا تھا میں تمہار
حفاظت کروں گا، آج بھی ہوں، میں نے کہا تھا تمہیں ٹھنڈے پانی کے چش
دوں گا، دے رہا ہوں۔

تمہارے اجداد نے مجھے یہیں دیکھا تھا، تمہاری نسلیں مجھ سے یہیں ملیں
میری ہر معاش چوٹیوں میں جلال اور جمال کا وہی انداز ہے جو باوقار، جوا
حسین عورت کے یہاں ہوتا ہے۔

ریاکاری

پہلے اس کا ایک ہی چہرہ دیکھا میں نے
صاف، سجل، خوش رنگ
نگاہوں میں ٹھنڈک
باتوں میں اک میٹھی خوشبو، ہنسی میں اک رنگین گھلاوٹ
اُس سے مجھے کچھ کام نہیں تھا،
میں بھی بھولا، وہ بھی بھولا، ملتے تھے اور ہنس لیتے تھے
میں بھی خوش تھا وہ بھی خوش تھا

اِک دن اُس کو کام تھا مجھ سے۔

ردا

سیاہ رات چھپائے ہوئے ستاروں کو
ردا اُڑھائے ہوئے اک مہیب اور غلیظ
خوشی منافقؔ ہے
ہر اک قدم پہ مگر خوفِ صبح سے لرزاں
کسی اندھیرے کوئیں کی عمیق ظلمت میں
پناہ لینے کو بے اختیار بڑھنے لگی
ستارے لڑتے رہے ڈوبتے رہے لیکن
وفورِ شوقِ سحر میں لرز لرز کے بڑھے
اور ایک منزلِ جہدِ بقا
وجودِ نور کی تاریک تیز کرنوں سے
سیاہ کہنہ ردائے غلیظ چاک ہوئی

سایا اور سورج

سورج جب مشرق میں تھا
میں مغرب کو جاتا تھا
سایہ میرے آگے تھا
سورج میرے پیچھے تھا
اور جب میں واپس آیا
سورج میرے آگے تھا
سایہ پیچھے پیچھے تھا
پورب پچھم کچھ بھی نہیں
سایا اور سورج کیا ہیں؟
ہم جیسے اُن کو دیکھیں، ہم جس جانب کو جائیں
دونوں ہمارے پیرو ہیں، یا ہم اُن کے پیرو ہیں؟